عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ

طلوعِ اسلام

March 1940

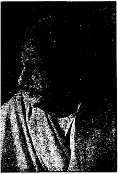

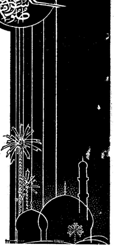

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی حیات اجتماعیہ کا ماہوار مجلّہ

طلوعِ اسلام

دہلی

(دورِ جدید)

مرتب
(اخوندزادہ) حسین امام

بدل اشتراک
پانچ روپیہ سالانہ۔ ششماہی تین روپے

جلد ۳ — شمارہ ۳ — محرم الحرام ۱۳۵۹ھ مطابق مارچ ۱۹۴۰ء

فہرست مضامین

۱	سپاسنامہ	ادارہ	۲-۶
۲	صدارت کانگریس "پر تبریک"	حضرت علامہ اقبالؒ	۷
۳	لمعات	ادارہ	۸-۲۱
۴	صبح امید		۲۳-۲۶
۵	یادِ اقبالؒ	جناب اسد ملتانی	۲۷
۶	شخصیت پرستی (۱)	جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز	۲۸-۴۳
۷	نواب آف ممدوٹ کی تبادل اسکیم	میاں محمد رفیق صاحب خاور بی اے	۴۴-۵۷
۸	حقایق و عبر	ادارہ	۵۸-۷۴
۹	سلیم کے نام.....	جناب پرویز صاحب	۷۴-۷۹
۱۰	ترجمان القرآن (مولانا آزاد)	جناب سید نذیر احمد صاحب کاشمیری	۸۰-۹۴
۱۱	اصل میں دونوں ایک ہیں		۸۸-۹۶
۱۲	نقد و نظر		۹۷-۱۰۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرکزِ ملت ← لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ! مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ → مرکزِ ملت

فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا

مرکزی فیصلوں کی اطاعت ہی ایمان ہے

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا

اِعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا — اللہ کی رسی کو سب ملکر مضبوطی سے تھام لو اور اس سے علیحدہ مت ہو

اِسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ — بات مانو اللہ و رسول کی جب تمہیں اس بات کے لئے بلائیں جو تمہیں زندگی عطا کرتی ہو

یعنے

مرکزِ مرکزی کی اطاعت اور جماعت پیدا کرو

اِس لیے کہ

جو جماعت سے علیحدہ ہوا وہ جہنم میں گیا
عَلَیْکُمْ بِالْجَمَاعَةِ فَاِنَّهٗ مَنْ شَذَّ شُذَّ فِی النَّارِ
(فرمانِ رسولؐ)

جماعت کے بغیر اسلام کچھ نہیں !
لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِالْجَمَاعَةِ
(قول حضرت عمرؓ)

(اقبال)

چیست ملت اے کہ گوئی لا الٰہ
با ہزاران چشم بودن یک نگاہ
بگذر از بے مرکزی پائندہ شو

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بہ شرف نظر

شیر بیشۂ بیباکی و حریت ۔ ضیغم نیستانِ جرأت و بسالت ۔ شاہینِ افلاکِ تدبر و سیاست ۔ پروانۂ شمعِ اخوت و حمیت ۔ طرۂ کلاہِ ملک و ملت ۔ بطلِ جلیلِ ہندیاں ۔ و قائدِ اعظمِ اسلامیاں ۔ عظمت مآب ۔ محترم المقام جناب محمد علی جناح ۔ مدظلہ العالی ۔

بتقریب سالانہ اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ بمقام لاہور

حریت نواز! ذرا تصور میں لائیے ایسے وقت کو کہ ایک وحشت انگیز ہولناک بیابان میں راہ گم کردہ مسافروں کا ایک بکھرا ہوا قافلہ نشانِ منزل سے مایوس ہو کر ضعفِ عزیمت سے پا شکستہ بیٹھ چکا ہو ۔ ایک درماندہ راہرو کی صدائے دردناک جو آوازِ رحیل کا کام دے رہی تھی ۔ فطرت کے اٹل قوانین کے ماتحت خاموش ہو چکی ہو ۔ شام کا بھیانک سناٹا ۔ سر پر منڈلانے والی شب تیرہ و تار کی ہیبت انگیزیوں کا پیام جانکاہ دے رہا ہو ۔ غاروں میں چھپے ہوئے درندوں کے پاؤں کی آہٹ موت کو قریب تر لاتی نظر آ رہی ہو ۔ درختوں کی اوٹ میں بیٹھے ہوئے رہزنوں کی ریشہ دوانیاں دامنِ صحرا پر پھیلتے ہوئے اندھیرے کے ساتھ بڑھتی چلی آ رہی ہوں ۔ وہ لوگ جن کی قیادت و سیادت پر بھروسہ تھا ۔ برادرانِ یوسف کی طرح اپنے قافلہ کی گراں بہا متاع دوسروں کے ہاتھ بیچ ڈالنے کی فکر میں ہوں ۔ غرضیکہ ہلاکت یقینی اور تباہی اٹل معلوم ہوتی ہو ۔ افرادِ قافلہ میں سے جن کے دلوں میں اس الم انگیز کیفیت کا احساس ہو ان کی نگاہیں رہ رہ کر آسمان کی طرف اٹھ رہی ہوں ۔ کہ فوراً افقِ امید سے ایک شاہسوار رواں دواں ۔ امیدوں کی ایک دنیا اپنے ساتھ لئے ان سوختہ سامانوں کی طرف

بڑھتا چلا آئے۔ منتشر افراد کارواں کو پھر سے ایک مرکز پر جمع ہونے کی دعوت دے اور اپنوں اور بیگانوں کی تیار کردہ ہلاکت و بربادی کی گھاٹیوں سے بچاتا ہوا۔ انھیں کسی محفوظ مقام کی طرف لے جانے کی فکر کرے۔ اندازہ فرمائیے۔ کہ جو قلبی کیفیت اُس وقت ان راہ گم کردہ مسافروں کی ہوگی۔ وہی حالت آج ملت اسلامیہ (ہندیہ) کی ہے۔ تحریک آزادی کے آغاز میں مسلمانوں کی عمومی حالت یہ تھی کہ یہ ریت کے ذرّوں کی طرح بکھرے پڑے تھے کہ تیز ہوا کا جھونکا آتا اور انھیں ادھر سے اُدھر اُڑائے جاتا پانی کی رو آتی اور انھیں اپنے ساتھ بہائے جاتی۔ اس کاروانِ بے سالار کی متاعِ گراں بہا کو لوٹنے کے لیے چاروں طرف سے قومیں ہجوم کرکے آرہی تھیں۔ غیر تو غیر۔ خود اپنوں کی یہ حالت تھی کہ ان کی سحر طرازیاں اور فسوں سازیاں۔ ملتِ بیضا کو خدائے طور سینا سے ہٹا کر گوسالہ پرستی کی دعوت دیتی تھیں غرضیکہ حالت یہ تھی۔ کہ

نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو ترس گئے تھے کسی مردِ راہ داں کے لیے

قوم کی صحیح راہنمائی کرنے والے ایک ایک کرکے چل بسے تھے۔ بزمِ ملت کی آخری شمع جس کی ضیا پاشیوں سے لاکھوں آنکھیں پرنور تھیں۔ ۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء کی صبح کو بجھ چکی تھی۔ اس کس مپرسی اور بیکسی کے عالم میں اللہ تعالیٰ نے اس منتشر قافلہ کی شیرازہ بندی کے لئے آپ کی ذات گرامی کو چن لیا۔ اور آپ کی نگاہ دور رس نے اس قافلے کو بتایا۔ کہ ان کے گرد و پیش کس کس قسم کی خطرناک گھاٹیاں موجود ہیں۔ وہ گھاٹیاں کہ جن میں کہیں "متحدہ قومیت" کے دامِ ہمرنگ زمین میں کبوترِ حرم کو پھانسنے کی تجویزیں ہو رہی تھیں۔ کہیں کسی منبر سے یہ آواز آرہی تھی کہ قومیتیں مذہب سے نہیں، اوطان سے بنتی ہیں۔ اور یوں اس طائرِ لاہوتی کے بال و پر کو غبار آلودۂ ارض و بوم بنا کر امتِ رسول "کافۃ للناس" کو جغرافیائی حدود کی آب و گِل میں محبوس کیا جا رہا تھا۔ کہیں "امرھم شوریٰ بینھم" کی حامل قوم کی نگاہوں میں مخلوط انتخاب کے سراب کو آبِ حیوان بنا کر دکھایا جا رہا تھا۔ کہیں اس "اولی الامر منکم" کی مامور جماعت کے لئے غیر مسلموں کی امامت و قیادت کو عین دین قرار دیا جا رہا تھا۔ کہیں انگریز کے خلاف "متحدہ محاذ" کے طلسم سے کفار و مشرکین سے تولّی کے جواز کے فتاویٰ شایع ہو رہے تھے۔ ایک طرف ایک مغنّیِ آتش نفس سرود گاہِ واردھا کی مستعار لے میں یہ خوب آور گیت گا رہا تھا کہ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہیں اس لیے اسلام کو کسی دوسرے مذہب پہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرکزِ ملت ← لا الٰہ الا اللہ ! محمد رسول اللہ → مرکزِ ملت

فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما

مرکزی فیصلوں کی اطاعت ہی ایمان ہے

یاایھا الذین امنوا

اعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا	استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم
اللہ کی رسی کو سب ملکر مضبوطی سے تھام لو اور اس سے علیحدہ مت ہو	بات مانو اللہ و رسول کی جب تمہیں اس بات کے لئے بلائیں جو تمہیں زندگی عطا کرتی ہو

یعنی

مرکز، مرکز کی اطاعت اور جماعت پیدا کرو

اس لیے کہ

جو جماعت سے علیحدہ ہوا وہ جہنم میں گیا	جماعت کے بغیر اسلام کچھ نہیں !
علیکم بالجماعۃ فانہ من شذ شذ فی النار	لا اسلام الا بالجماعۃ
(فرمانِ رسولؐ)	(قول حضرت عمرؓ)

(اقبال)

چیست ملت اے کہ گوئی لا الٰہ با ہزاراں چشم بودن یک نگاہ

بگذر از بے مرکزی پائندہ شو

کوئی فوقیت نہیں - دوسری طرف کچھ خداوندانِ مکتب - شاہین بچوں کے لئے - اہنسا کی بازو شکن تعلیم کی اسکیمیں تیار کر رہے تھے - ہندو اپنے ذہن میں "رام راج" کے قیام کے منصوبے باندھ رہا تھا۔ اور اس کے لئے انگریز سے "شریفانہ معاہدے" Gentleman's agreement استوار کر رہا تھا - ہندوؤں کے شور و غوغا سے متأثر انگریز بھی مسلمانوں کو بلا تأمل ہندو کے ہاتھ میں دیدینے پر آمادہ تھا - کہ وہ اپنی پانچ ہزار سالہ غلامی کا جذبۂ انتقام اس کے خون سے ٹھنڈا کرے - جو لوگ اغیار کی صفوں میں کھڑے ہو کر ملتِ اسلامیہ کی نمایندگی کا دعوے کر رہے تھے ان میں اتنا سمجھنے کی بھی استطاعت نہ تھی کہ بساطِ سیاست پر یہ آئینی مہرے کس طرح چلائے جا رہے ہیں - ہندو خوش تھا کہ میں نے ۹ کروڑ فرزندانِ توحید کو اچھوتوں کی صف میں ملا دیا۔ انگریز راضی تھا کہ وہ خنجرِ ہلال جس کے بے نیام ہونے کے خوف سے کلیجۂ صلیب میں ہمیشہ دھڑکن رہتی تھی اسے گنگا کی لہروں میں بہا دیا گیا کہ اس کس مپرسی کے عالم اور اس خلفشار و تشتت کے وقت آپ آگے بڑھے اور ہندوؤں اور انگریزوں کے ہر خفیہ منصوبے اور ہر پوشیدہ سازش کو ایک ایک کر کے بے نقاب کر دیا اور یوں ان کے تصورات کی حسین دنیا کو ایک خوابِ پریشان میں تبدیل کر کے رکھ دیا اور ساری دنیا پر اس حقیقتِ عظمیٰ کو واضح کر دیا کہ

آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

بطلِ جلیل القدر!

ہمیں خوب احساس ہے کہ آپ کی منزل کس قدر کٹھن اور راستہ میں کس قدر مشکلات کا سامنا ہے - جہاں تک غیروں کا تعلق ہے - مسلمان جیسی منتشر قوم کے مقابلہ میں ہندوستان اور برطانیہ کی دو بڑی قوتوں کا متحدہ محاذ ہی کچھ کم سنگِ گراں نہیں لیکن غیروں سے کہیں زیادہ مہیب اور جانگداز مشکلات خود اپنوں کی پیدا کردہ ہیں ان "اپنوں" کو بھی چھوڑیئے جو محض اپنی سنہری اور روپہلی مصلحت کوشیوں کی خاطر نشرگاہ وار دھا (Radio Station) کے آلاتِ مکبر الصوت (Loud Speakers) بنے ہوئے ہیں - وہ تو اس مخالفت پر مجبور ہیں - لیکن سب سے زیادہ ماتم تو ان "مخلص منافقین" کا ہے جن کی رفاقت و حمایت بیش ازیں نیست کہ

کافر نتوانی شد - ناچار مسلمان شو

جن کا مقصدِ وحید اپنے طرۂ وجاہت کا قیام و بقا ہے - خواہ یہ آستانۂ خواجۂ یثرب سے وابستگی ظاہر کرنے سے حاصل

ہو جائے یا لشکر بولہبی میں شمولیت سے - بایں ہمہ نہ ان غیروں کا ہجوم مخالفت ایسا ہے کہ اس سے کچھ خوف کھایا جائے اور نہ اپنوں میں سے بعض کی نوازشہائے بیجا اور دوسروں کے طعنہ ہائے دلخراش ایسے کہ ان کا غم کھایا جائے - کہ جو حق پر ہو اسے کسی کی مخالفت کی کیا پرواہ ہو سکتی ہے -

رہے ہیں اور ہیں فرعون تیری گھات میں اب تک
مگر کیا غم کہ تیری آستیں میں ہے ید بیضا

حریت مآب!

ہمیں اس بات کا بھی علم ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ تگ و دو حیات میں جو نصب العین آپ کے سامنے ہے وہ وہی ہے جو ہر مسلمان کی نگاہوں کے سامنے ہونا چاہیئے جس کے دل میں بہ حیثیت مسلمان زندہ رہنے کی تڑپ اور اپنی نسلوں کو بہ حیثیت مسلمان رکھنے کی آرزو موجزن ہے اور کسے معلوم نہیں کہ وہ نصب العین ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہند (Muslim India) کی تشکیل کے سوا اور کچھ نہیں جس طرح آپ احوال وظروف کا صحیح جائزہ لیتے ہوئے قدم بقدم اس درخشندہ نصب العین کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں - وہ آپ کی بلند نگہی اور حسن تدبر کا آئینہ دار ہے سطح بیں لوگوں نے آپ کو صرف ایک فاضل مقنن اور دیدہ ور مدبر کی حیثیت سے ہی پہچانا - لیکن جن لوگوں کو آپ کے قریب ہونے کی سعادت نصیب ہوئی ہے - وہ خوب جانتے ہیں کہ مبدء فیض نے آپکو اس قدر ذہن رسا کے ساتھ ساتھ کس قدر دل پرسوز و پر درد کی نعمتوں سے نوازا ہے -

خرد نے تجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ   سکھائی عشق نے تجھ کو حدیث رندانہ

اور قلب و نظر اور عقل و عشق کا یہی امتزاج ہے جو ایک ناخدائے کشتیٔ ملت کی متاع گراں بہا ہے -

نگہ بلند - سخن دل نواز - جاں پرسوز   یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لئے

عالی مرتبت!

آپ یقین فرمایئے کہ جس قوم کی فلاح و بہبود آپ کی زندگی کا منتہیٰ ہے - اس قوم کا سواد اعظم آپ کی قیادت و امارت پر کامل بھروسہ رکھتا ہے - اور ان کی خاطر آپ نے جو گرامی قدر قربانیاں کی ہیں -

ان کے دل میں ان کا پورا پورا احساس ہے۔ اس میں شبہ نہیں۔ کہ وہ سرزمین پنجاب جو ملت اسلامیہ کے اس اجتماع عظیم کی تقریب پر آپ کی تشریف آوری سے سرفراز ہونے والی ہے۔ اس میں آئینی نقطۂ نگاہ سے Constitutionally ابھی پراونشل لیگ کا قیام بھی عمل میں نہیں آسکا۔ لیکن ہمیں امید ہے کہ یہ حقیقت آپ کی نگاہ سے مستور نہ ہوگی۔ کہ پنجاب کا ایک ایک قریہ اور اس قریہ کے ایک ایک فرد کا دل آپکی عظمت و عقیدت کا نشیمن بنا ہوا ہے۔ بس کسی ایک مرد خود آگاہ و خدا دوست کے نعرۂ مستانہ کی دیر ہے یہ طوفان بلا انگیز کسی سے روکے نہیں رُکے گا۔ اس وقت بچے گا وہی جو کشتیٔ ملت میں اخلاص و دیانت سے سوار ہوگا۔ اور پکارنے والا پکارے گا کہ

لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللّٰهِ إِلَّا مَنْ رَّحِمَ

سیّد القوم!

ادارۂ طلوع اسلام۔ جسے ہزارہا پرخلوص اور صحیح النظر مسلمانوں کی ترجمانی کا فخر حاصل ہے اجلاس لیگ کی صدارت پر آپ کی خدمت میں ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتا ہے اور مستدعی ہے کہ جس نصب العین کی طرف آپ کا قدم اُٹھ رہا ہے۔ قوم کو اس کی طرف اور تیز گامی سے بڑھاتے جائیے۔ اس نصب العین کے حصول کے لئے اگر ضرورت پیش آئی تو آپ دیکھیں گے کہ قوم کس طرح کفن بر دوش و سر بکف آپ کی دعوت پر لبیک کہتی ہے۔

بانشۂ درویشی درساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن

اراکین ادارۂ طلوع اسلام۔ دہلی

مولانا ابو الکلام آزاد کی صدارتِ کانگریس پر
مرقدِ علامہ اقبال سے آواز

یہ مرقد سے صدا آئی "حرم کے رہنے والوں کو
شکایت تجھ سے ہے اے تارکِ آئینِ آبائی
ترا اے قیس کیوں کر ہوگیا سوزِ دروں ٹھنڈا
کہ لیلیٰ میں تو ہیں اب تک وہی اندازِ لیلائی
نہ تخمِ لا الٰہ تیری زمینِ شور سے پھوٹا
زمانے بھر میں رسوا ہے تری فطرت کی نازائی
ہوئی ہے تربیت آغوشِ بیتُ اللہ میں تیری
دلِ شوریدہ ہے لیکن صنم خانے کا سودائی
وفا آموختی از ما بکارِ دیگراں کردی
ربودی گوہرے از ما نثارِ دیگراں کردی"

(بانگِ درا)

لمعات

مارچ کے تیسرے ہفتے میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہو رہا ہے' ہندوستان کے مسلمان اس وقت جس نازک دور سے گزر رہے ہیں' اُن کے پیش نظر ہر وہ شخص جس کی نگاہوں میں بصیرت اور دل میں درد ہے' خود اندازہ کر سکتا ہے کہ ملت اسلامیہ کے اس اجتماع عظیم کی اہمیت کس قدر ہے۔ سطح بین لوگوں کے نزدیک تو ان اجتماعات میں صرف اتنا ہوتا ہے کہ کچھ لوگ یکجا جمع ہوئے۔ تقاریر ہوئیں۔ ریزولیوشن پاس ہوئے۔ اور جلسہ برخاست ہو گیا۔ لیکن جن کی نگاہیں ان ظواہر و رسوم کی سطحیت سے کچھ نیچے اترتی ہیں وہ اچھی طرح محسوس کرتے ہیں کہ ان اجتماعات کا نفسیاتی اثر کس قدر وسیع و عمیق ہوتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ آج ہمارے اجتماعات میں وہ اسلامی شان نہیں پیدا ہوتی۔ جو ہونی چاہیے اور اس کی وجہ۔ جیسا کہ ہم اشاعت سابقہ کے لمعات میں بیان کر چکے ہیں' واضح ہے کہ ہم اپنے "عہد جاہلیت" سے عہد اسلامی کی طرف رجوع کر رہے ہیں اسلئے اپنی پہلی ہی جست میں ہم اس مقام تک نہیں پہنچ سکتے' جو ہمارا منتہیٰ ہے۔ بایں ہمہ اس قسم کے ملی اجتماعات سے ہماری خاک کے بکھرے ہوئے ذروں میں نمو و حیات پیدا ہو جاتی ہے۔ منتشر قافلہ کے پریشان خاطر افراد کے دلوں میں اپنی گم گشتہ ہیئت قافلہ کی از سر نو تشکیل کا احساس پھر سے بیدار ہو جاتا ہے' جو شخص ان اجتماعات میں شامل ہونے کے لیے آتا ہے' وہ انفرادیت کی عجمی زندگی سے اجتماعیت کی اسلامی زندگی کی طرف قدم اٹھانے کا جذبہ لئے ہوئے آتا ہے اور جب واپس جاتا ہے تو اس جذبہ میں ایک تازہ ولولہ لیے ہوئے جاتا ہے جو اپنی اپنی جگہ پہنچ کر اپنے اپنے چھوٹے چھوٹے حلقوں میں ایک نئی زندگی پیدا کرنے کا موجب بنتا ہے۔ لہذا ضرورت ہے کہ آپ اپنے اس ملی اجتماع کو جس قدر بھی کامیاب بنا سکتے ہوں۔ بنائیے۔ کہ یہ اجتماع آپ کی قومی زندگی کا نشان ہے اور اس سے آپ کی اجتماعی قوت کا اندازہ لگ سکتا ہے۔

پھر اس اجتماع کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے' جب اس امر کو سامنے رکھا جائے' یہ اجتماع پنجاب

میں منعقد ہو رہا ہے۔ یہ حقیقت اب کسی دلیل کی محتاج نہیں کہ اسلامیانِ ہند کی نشاۃ ثانیہ کا مرکز ہندوستان کا شمال مغربی خطہ ہی ہوگا اور اس خطہ کی زندگی کا انحصار پنجاب کی زندگی پر ہے اسلئے ہماری موجودہ سیاسی کشمکش میں پنجاب کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے جیسے جسمِ انسانی میں قلب کے فساد پر تمام بدن کا فساد اور اس کی اصلاح پر تمام جسم کی اصلاح موقوف ہے اسی طرح پنجاب کی اصلاح میں تمام مسلمانانِ ہند کی زندگی اور اسکے فساد میں عالم بدبختی اہم سب کی موت ہے۔ اسوقت ہماری ملی مساعی کے کما حقہٗ مشکور نہ ہونے کا باعث ہی یہ ہے کہ پنجاب میں وہ قوتیں بروئے کار ہیں، جو اپنے انفرادی مصالح کو ملی مصالح پر ترجیح دیتی ہیں، اور اسلئے قوم میں اجتماعی زندگی پیدا ہونے کی راہ میں سنگِ گراں بنکر حائل ہیں۔ ان تمام موانع کے باوجود ہم پنجاب سے ناامید نہیں ہیں، اسلئے کہ "زندہ دلانِ پنجاب" میں اب بھی وہ روح موجود ہے کہ وہ اپنی ایک ہی کروٹ میں بڑی سے بڑی مخالف قوت کا تختہ اُلٹ کر رکھ دیں۔ جو قوم جان دینا جانتی ہو اس سے کبھی ناامید نہیں ہونا چاہیئے۔ پنجاب کو صرف ایک مردِ مومن کی ضرورت ہے جو اُنھیں ایک مرکز پر جمع کر کے صحیح راستے پر لے نکلے پھر آپ دیکھیں گے کہ برسوں کی منزلیں کس طرح لمحوں میں طے ہوتی ہیں۔

لاہور کا یہ آئیندہ اجتماع اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ یہ مسلمانانِ پنجاب کی زندگی کے مظاہرہ کی تقریب ہے، اِسلیئے ہماری تمام مسلمانانِ ہند سے بالعموم اور مسلمانانِ پنجاب سے بالخصوص استدعا ہے۔ کہ آپ اِس اجتماع کو عدیم النظیر بنانے میں ہر ممکن کوشش کیجیے، چہ عجب کہ یہی اجتماع آپ کی حیاتِ ملّیہ کے دَورِ جدید کی ابتدا بنجائے۔

جہاں اگرچہ دِگرگوں ہے قُم باذنِ اللہ
وہی زمیں وہی گردوں ہے قُم باذنِ اللہ
کیا نوائے اناالحق کو آتشیں جس نے
تیری رگوں میں وہی خوں ہے قُم باذنِ اللہ
غمیں نہ ہو کہ پراگندہ ہے شعور تیرا!
فرنگیوں کا یہ افسوں ہے قُم باذنِ اللہ

ایک چیز کچھ عرصہ سے ہمارے سامنے تھی لیکن پچھلے دنوں سے اسکی ضرورت اتنی شدت سے محسوس ہو رہی ہے کہ اُسے مزید التوا میں نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ ظاہر ہے کہ دَورِ حاضرہ میں سیاسی کش مکش زیادہ تر آئین و دستور کے دائرہ تک محدود رہتی ہے اور قوموں کی موت و حیات کے فیصلے ایک بڑی حد تک میدان کارزار کے بجائے سیاسی مُدبّرین کی میزوں پر ہوتے ہیں، یہ تو ہم کہہ نہیں سکتے کہ مستقبل میں ہندوستان میں کیا ہوگا لیکن آج تو بہرحال یہ جنگ آئین و دستور کی بساط پر ہی لڑی جا رہی ہے، اس بساط پر مسٹر جناح کس بلند ہمّتی، ہمت۔ استقلال، حُریت اور بیباکی سے مصروفِ نبرد آزمائی ہیں، اربابِ سیاست کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں لیکن قوم کا وہ کثیر طبقہ جو انگریزی زبان سے ناآشنا ہے اُسے قطعاً معلوم نہیں ہوتا کہ ملک میں کیا ہو رہا ہے۔ اور انکا ترجمان کس جرأت و آزادی سے اُنکے مقدمہ کی پیروی کر رہا ہے، ضرورت اس امر کی ہے کہ اس طبقہ کو مسٹر جناح کے ان تمام مساعی سے ساتھ کے ساتھ روشناس کرایا جائے تاکہ اُنکے حوصلے بلند رہیں، اور وہ ان فتنہ پردازوں کے غلط پروپیگنڈا کے فریب میں نہ آسکیں جو عوام کی اس جہالت سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر مسٹر جناح کو سرکار پرست ٹوڈی کی حیثیت میں پیش کرتے رہتے ہیں۔ یہ ضرورت لامحالہ اُردو اخبارات کے ذریعہ ہی پوری ہو سکتی ہے لیکن ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اوّل تو ہمارے اُردو اخبارات میں ان باتوں کا تذکرہ ہی بہت کم ہوتا ہے، اور اگر کہیں کوئی اخبار مسٹر جناح کے کسی بیان یا تقریر کا ملخص شائع بھی کرتا ہے، تو ایسی مسخ شدہ صورت میں کہ جب کوئی ایسا شخص اسے دیکھتا ہے جس نے اصل کو بھی دیکھا ہو تو وہ سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے، طلوعِ اسلام مہینہ بھر کے بعد شائع ہوتا ہے، اور ایک ماہوار پرچہ کے محدود صفحات ان تفصیلات کے لیے جتنی گنجائش نکال سکتے ہیں وہ بالکل عیاں ہے اسلیئے ہم روزنامہ اور ہفتہ وار اُردو اخبارات کی توجہ خاص طور پر اس ضرورت کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ وہ اس امر کا انتظام کریں کہ مسٹر جناح کی ہر تقریر اور بیان کا صحیح صحیح ترجمہ التزاماً شائع ہوتا رہے۔ یہ قوم کی بڑی خدمت ہوگی اور اس سے دَورِ حاضرہ کی ایک اہم ضرورت پوری ہوگی +

موجودہ جنگ یورپ میں جب ہلاکت و بربادی کے بہت سے نئے نئے ذرائع میدان میں آگئے،

اور دیکھا گیا کہ ان میں سے ہر ایک فریقِ مخالف کے پاس موجود ہے تو ہٹلر نے اعلان کیا کہ کوئی بات نہیں! میرے پاس ابھی ایک ایسا پوشیدہ ہتھیار رکھا ہے۔ کہ جس کا کسی کے پاس جواب نہیں ہوگا۔

یورپ کی طرح ہندوستان میں بھی ایک جنگ جاری ہے، یہ جنگ گولہ بارود کی نہیں، بلکہ آئین و دستور کی ہے، اسلئے اس میں آلاتِ حرب بھی اسی نوعیت کے استعمال ہوتے ہیں مسٹر گاندھی دنیا پر یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ کہ کانگریس تمام ہندوستانیوں کی نمائندہ جماعت ہے اور مسٹر جناح یہ ثابت کرتے ہیں کہ کانگریس ہندوؤں کی جماعت ہے۔ مسلمانوں کی نمائندہ مسلم لیگ ہے، اس میدان میں جب مسٹر گاندھی کے ترکش کے تمام تیر ختم ہوگئے تو انہوں نے بھی ہٹلر کی طرح کہا کہ کوئی بات نہیں! میںنے اپنی "زنبیل عمر عیار" میں ایک ایسا حربہ چھپا رکھا ہے جس کی مدافعت ناممکن ہوگی۔ دنیا ہنوز ہر ہٹلر کے پوشیدہ حربہ کے انتظار میں ہے لیکن مسٹر گاندھی کا پوشیدہ حربہ مولانا آزاد کے انتخاب صدارت کی شکل میں بے نقاب ہوگیا۔

کہتے ہیں کہ جنگِ صفین میں جب امیر معاویہؓ کے لشکر نے دیکھا کہ سمتِ مخالف سے تیروں کا طوفان روکے سے نہیں رکتا تو انہوں نے اپنے نیزوں پر قرآن کریم لٹکا کر انہیں اپنے سامنے کر دیا کہ لشکرِ حضرت علیؓ کے تیر انداز ہمارے سینوں کا نہیں تو قرآن کریم کا تو ضرور لحاظ کرینگے، چنانچہ یہی ہوا اور سامنے سے تیر برسنے بند ہوگئے۔

یہ بھی سُنا ہے کہ جب ہمایوں نے اپنے غدار بھائی کے خلاف یورش کی اور وہ کابل کے قلعہ میں محصور ہوگیا تو اُسنے قلعہ کی دیوار کے اس مقام پر، جو ہمایوں کی فوج کا خاص نشانہ تھا۔ خورد سال اکبر کو لاکر بٹھا دیا جو اسوقت اُسکے قبضہ میں تھا تاکہ ہمایوں اپنے بچے کی جان کی خاطر اس سیلاب انگیزی سے رُک جائے۔

مسٹر گاندھی نے یہ واقعات سن رکھے تھے جب انھوں نے دیکھا کہ اس میدان کارزار میں مسٹر جناح کے تیروں کا کوئی جواب نہیں بن پڑتا تو انھوں نے مولانا آزاد کو کرسیٔ صدارت پر بٹھا کر آگے بڑھا دیا کہ اب تو فریقِ مخالف کے تیر اندازوں کے ہاتھ رک ہی جائیں گے لیکن حقیقتِ حال کا صحیح صحیح جائزہ نہیں لے سکے انھیں یہ واضح ہونا چاہیئے کہ مسلمانوں کو اب خوب معلوم ہے کہ جس چیز کو گاندھی جی نیزوں پر لٹکا کر سامنے لا رہے ہیں! وہ "قرآن" نہیں ہے بلکہ قرآن کی جلد میں "گیتا" ہے، وہ جانتے ہیں کہ جس "بچے" کو اکبر بنا کر قلعہ کی دیوار پر بٹھایا

جا رہا ہے۔ وہ جیتا جاگتا بچہ نہیں، بلکہ سیلولائڈ کا کھلونا ہے۔ مسٹر گاندھی کو معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ اُنکا یہ حربہ ایک استعمال شدہ کارتوس سے زیادہ وزنی نہیں ہے، وہ ان شاطرانہ چالوں سے دُنیا کی آنکھوں میں خاک نہیں جھونک سکتے۔ دنیا جانتی ہے کہ جب وائسرائے صاحب کی ایگزیکیٹو کونسل میں کسی سر جگدیش شاہ یا سر ظفراللہ خاں کی شرکت کے باوجود گورنمنٹ انگریزی کی رہتی ہے تو کانگریس کی کرسی صدارت پر کسی مولانا آزاد کی موجودگی کانگریس کو ہندو جماعت سے کچھ اور نہیں بنا سکتی، دنیا اب خوب جانتی ہے کہ اسٹیج پر پنڈت نہرو ہوں۔ یا مولانا آزاد۔ ان کی حیثیت ایک ایکٹر ہی کی ہے، تماشہ کا پورا پروگرام اُس ڈائرکٹر کے ہاتھ میں ہے جو اسٹیج کے پیچھے بیٹھا ہے۔ اور یہ بات کوئی چھپی ڈھکی تو ہے نہیں، مولانا آزاد نے انتخاب صدارت کے بعد اپنی پہلی تقریر میں اسکا اعتراف کرتے ہوئے فرمایا کہ:۔

"میرا انتخاب دراصل اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ لوگوں کو مہاتما گاندھی کی ذات پر کتنا اعتماد ہے، اور اُنکے پروگرام کو ملک کس قدر پسند کرتا ہے"۔

یعنی "میں کچھ نہیں ہوں، صدر بھی دراصل مہاتما جی ہی ہیں اور یہ پروگرام بھی انہی کا ہے"۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ پیر خانہ وارد ہا سے خرقۂ خلافت عطا ہی اُسی کو ہوتا ہے جو اپنے "فانی الشیخ" ہونے کا پورا پورا ثبوت دیدے جس کی عقیدت وارادت میں ذرا بھی شبہ ہو جس میں اپنی خودی کی تھوڑی سی بھی رمق باقی ہو۔ وہ فوراً راندۂ درگاہ ہو جاتا ہے اعتبار نہ ہو تو پوچھئے مسٹر بوس سے کہ اُنکے ساتھ تری پوری میں کیا گزری تھی!

ہاں تو جب حقیقت یہ ہو تو پھر یہ خیال کہ ایک مسلمان کو صدر بنا کر دُنیا کو یہ دھوکا دیا جا سکتا ہے کہ کانگریس ہندو مسلمانوں کی مشترکہ نمائندگی کر سکتی ہے، دُنیا کو دھوکا نہیں خود اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔

مولانا آزاد کی صدارت سے ایک فائدہ ضرور ہوا۔ اُنھوں نے جب سے اپنا قدیم اسلامی مسلک چھوڑ کر جدید قومی مشرب اختیار کیا تھا۔ اُن کی زبان بند اور انکا قلم خشک ہو گیا تھا۔ اور ان کی اِس خاموشی سے اکثر دھوکا دیا جاتا تھا کہ مولانا صاحب نے یہ جدید پیرہن بنا بر مصلحت پہن رکھا ہے، ورنہ دل سے وہ اپنے قدیم مسلک کے ہی حامی ہیں۔ چنانچہ ابھی حال ہی میں اخبار مدینہ کے ایڈیٹر

نے لکھا تھا کہ مولانا صاحب نے ایک نجی گفتگو میں فرمایا کہ وہ مسلمانوں کو ایک جُداگانہ قوم سمجھتے ہیں، اور ہندو لیڈروں کے ساتھ انکا اشتراکِ عمل انگریز کے خلاف مشترکہ محاذ کی خاطر ہے۔ وغیرہ وغیرہ لیکن اب جو مولانا صاحب صدر بنا دیئے گئے ہیں، انھیں بولنا بھی پڑیگا۔ اور لکھنا بھی۔ اور یوں ساری حقیقت بے نقاب ہو جائیگی۔ چنانچہ مدیر مدینہ کے محولہ بالا بیان کی تردید تو انھوں نے اپنی پہلی ہی تقریر میں فرما دی جب اُنھوں نے لاہور میں کہا کہ میں مسٹر جناح کے اِس نظریہ کی کبھی تائید نہیں کر سکتا کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان الگ الگ قومیں ہیں۔ یہ تو دورِ اوّل کا ماجرا ہے، ابھی دیکھیے سال بھر میں کیا کچھ ہوتا ہے، اسلیے یہ بھی اچھا ہوا کہ اب مولانا صاحب بے نقاب ہو کر سامنے آ گئے۔ اِس طرح بہت سے سادہ لوح مسلمان اِس غلط فہمی کے اندھیرے سے نکل آئیں گے جو مولانا صاحب سے اُن کی دیرینہ عقیدت و ارادت کی بنا پر ان کی آنکھوں کے سامنے چھایا ہوا تھا۔

عدو شود سببِ خیر گر خدا خواہد

اِسے کہتے ہیں،

ہم نے کسی سابقہ اشاعت میں ضمناً لکھا تھا کہ تحریکِ خاکساران کے متعلق اپنے خیالات تفصیل سے لکھیں گے، گزشتہ ماہ چند ایک احباب نے ہمیں یہ وعدہ یاد دلایا، ہم خود بھی اُسے بھولے نہیں ہیں لیکن ہر ماہ ایسی ایسی اہم باتیں سامنے آجاتی رہیں کہ اس طرف توجہ ہی نہیں دی جاسکی (اگرچہ سابقہ ماہ کے لمعات کو اگر بنگاہِ غائر دیکھا جائے تو اِس مسئلہ کے اکثر گوشے واضح ہو جاتے ہیں) جیسا کہ ہم نے اُن لمعات میں لکھا تھا۔ ہمارے نزدیک اِس تشتت و انتشار کے دَور میں ہر وہ قدم جو مسلمانوں کی جُداگانہ ملی اجتماعیت کی تشکیل و بقا کے لیئے اٹھتا ہے، مبارک ہے۔ بشرطیکہ بنیادی طور پر وہ تنظیم اصولِ اسلام کے خلاف نہ جائے۔ کہتے ہیں کہ سرسید مرحوم نے جب اسلام کی تعلیم اِس رنگ میں پیش کی کہ وہ اُس دَور کے انگریزی خواں نوجوانوں کی عقل کو اپیل کر جائے تو ان پر اعتراض کیا گیا کہ اِس سے تو ان پر "نیچریت" غالب آجائے گی۔ انکے عقاید بگڑ جائیں گے، اِسکے جواب میں اُنھوں نے کہا کہ اسوقت

نوجوانوں کا طبقہ فلسفہ اور سائنس کی جدید تعلیم کی وجہ سے خدا کی ہستی سے منکر ہو رہا ہے اور اگر یہی حالت کچھ عرصہ تک جاری رہی تو عجب نہیں کہ یہ طبقہ مُلّا کے پیش کردہ اسلام سے متنفر ہو کر اسلام ہی کو خیرباد کہہ دے اس لیئے آج تو مجھے صرف اتنی فکر ہے کہ یہ لوگ حلقۂ اسلام کے اندر رہیں اُنکے عقاید صحیح معیار پر پورے نہ اتر ینگے لیکن یہ رہینگے "تو مسلمان اور پھر اسکے بعد اُن کی اولاد مسلمانوں کے بچے کہلائیگی۔ اُنکے عقاید آسانی سے درست کیئے جا سکیں گے لیکن اگر آج یہ لوگ اسلام چھوڑ کر عیسائی ہو گئے تو قیامت تک اُن کی نسلیں عیسائی رہیں گی اور ایک عیسائی کو مسلمان بنانا اتنا آسان نہیں جتنا ایک غلط عقیدہ کے مسلمان کو علم صحیح کی روشنی میں صحیح عقیدہ پر لے آنا آسان ہے۔ "نیچریت" اور نیچریت کی اشاعت کرنے والے خیالات اگر صحیح نہیں ہیں تو خود بخود مٹ جائینگے لیکن ایک قوم کو مسلمان چھوڑ جائیں گے جنکی اصلاح رفتہ رفتہ ہوتی رہے گی۔

ہم آج اِس مصیبت سے بھی ایک زیادہ مہلک مصیبت میں گرفتار ہیں جس کا سامنا سرسید مرحوم کو کرنا پڑا تھا۔ اُسوقت تو محض فلسفہ اور سائنس کے نظریات کی رُو سے مسلمان نوجوانوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی جاتی تھی لیکن آج ہندوستان میں ۲۳ کروڑ ہندوؤں کی متحدہ اور منظم جماعت انگریزوں کی پوری حمایت کا سایہ اپنے سر پر لیئے ہوئے مسلمانوں کی پوری کی پوری قوم کو اپنے اندر جذب کرنے کی مہم میں سرگرم عمل ہے اور یہ سب کچھ بساطِ سیاست پر ایسی غیر محسوس چالوں سے کیا جا رہا ہے کہ فریق مخالف کو اُنکے نتائج کا علم اسوقت ہوتا ہے، جب بازی مات ہو چکی ہوتی ہے۔ ذرا ہندوستان کے طول و عرض پر نگاہ ڈالیئے اور دیکھیئے کہ ہندو اور انگریز کی اِس متحدہ سازش کا جواب دینے والا تو ایک طرف اسے کوئی سمجھنے والا بھی موجود ہے؟ یہ تو کچھ اللہ ہی کو منظور تھا۔ کہ اُسنے مسلمانوں کی اِس قوم کو جیسی کچھ بھی یہ ہے، گونڈ اور بھیلوں کی طرح فنا ہونے سے بچانا تھا کہ اُسنے ایسے نازک دور میں مسٹر جناح کو آگے بڑھا دیا اور انھوں نے اپنی خداداد ذہانت و فطانت سے اِس سیلاب فنا کو یوں روک لیا ورنہ عوام کو تو کچھ خبر ہی نہ تھی کہ ہو کیا رہا ہے! ورخواص میں سے آپ کی قوم کا طبقۂ علماء ہندوؤں کی اِس سازش کا آلۂ کار بنایا جا چکا تھا اور ان میں سے بھی اکثر کو عوام کی طرح خبر نہ تھی کہ ہم سے کام کیا لیا جا رہا ہے

اب کہیئے کہ ایسے نازک وقت میں ہم اس شخص کی محض اِسلیئے مخالفت شروع کردیں۔ کہ اُس کی شکل وصورت اس مقدس طائفہ علمار جیسی نہیں جنکا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے یا اُسے علوم شریعت پر عبور نہیں! ہمیں اس سے بے حد مسرت ہوتی اگر ہمارے قومی راہ نما میں یہ خصوصیات موجود ہوتیں۔ لیکن جب صورت یہ آپڑی ہو کہ ایسی خصوصیات کے حامل کشتیٔ ملت کو اپنے ہاتھوں گنگا جمنا کے سنگم پر ڈبونے لیے جارہے ہوں۔ تو کیا ہمارے لیئے یہ زیبا ہے کہ ہم اپنے اس ناخدا کے ہاتھ سے جو قوم کی کشتی کو گرداب بلا سے بچاکر نکال رہا ہو محض اس جرم کی بنار پر چپو چھین لیں کہ اُسے علوم شرعیہ پر عبور حاصل نہیں ہوا! غور کیجئے کہ ایسے وقت میں اس سے چپو چھین لینے میں اس کا تو کچھ نہیں بگڑے گا، کشتی تباہ ہوجائیگی! ہم یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح اسوقت کشتی بچ کر لبِ ساحل آجائے، باقی سب باتیں بعد میں دیکھی جائیں گی! اس لیئے کہ اگر اسوقت کشتی ہی ڈوب گئی تو اسکے بعد اصلاح کس کی ہوگی!

اور پھر یہ بھی سوچیے کہ مسٹر جناح نے کون سی بات اصولِ اسلام کے خلاف کہی ہے! اس دو تین برس کی مسلسل جدوجہد کے بعد جو مسلمات انھوں نے پیش کیئے ہیں اور جنکے تسلیم کرانے پر وہ مُصر ہیں وہ مختصر الفاظ یہ ہیں کہ :-

(۱) مسلمان ایک جداگانہ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور غیر مسلموں کے ساتھ ملکر متحدہ قومیت نہیں بناسکتے اور :-

(۲) وہ مغربی انداز جمہوریت جس میں معاملات کے فیصلے محض کثرتِ آرار کے تابع ہوتے ہیں، ہندوستانی مسلمانوں کے لیئے قابلِ قبول نہیں۔

یہ تو ہیں مسلمات اور نصب العین وہ یہ پیش کرتے ہیں:-

"انگریز چاہتے ہیں کہ ہم ہندوستان پر حکومت کریں مہاتما گاندھی چاہتے ہیں کہ ہم ہندوستان پر حکومت کریں لیکن ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم نہ انگریز کو اپنے اوپر حکومت کرنے دینگے نہ ہندو کو خواہ یہ الگ الگ ہوں یا دونوں متحد ہوکر ایسا کرنا چاہیں"

(ہندوستان ٹائمز مورخہ ۲۳/۲/۴۰)

ہم آپ سے صرف اتنا عرض کرینگے کہ قرآن و حدیث کے کسی بڑے سے بڑے عالم سے پوچھئے کہ ان میں سے کون سی چیز اصولِ اسلام کے خلاف ہے! پھر آپ کہیئے کہ وہ کون سی تباہی ہے جس کی طرف ہمیں مسٹر جناح لیئے جا رہے ہیں! اور جس سے بچنے کی تلقین آج سب سے بڑی اسلامی خدمت سمجھی جاتی ہے؟

مسٹر جناح نے بساطِ آئین و دساتیر کے گوشوں کو سنبھالا اور عین اسی وقت علامہ مشرقی نے مسلمانوں کے سامنے اِس حقیقت کو بے نقاب کیا، کہ یاد رکھو!

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے!
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات! (اقبالؒ)

اور مسلمانوں کو سمجھایا کہ اِس موت سے بچنے کا واحد علاج یہ ہے، کہ اپنے اندر عسکری نظام کے احیاء سے قوم کے بازوؤں میں فولادی قوت پیدا کردو۔

جو اعتراضات مسٹر جناح پر عائد ہوتے تھے، وہ تو علامہ مشرقی پر ہو نہیں سکتے تھے۔ اُن کی شکل و صورت متشرع ہے، جہاں تک ہمیں معلوم ہے وہ صوم و صلوٰۃ کے بھی پابند ہیں۔ علوم دینی سے بھی واقف ہیں اُنکے خلاف کچھ اور نہیں بن پڑا، تو یہ ہی سہی کہ اُنکے عقائد درست نہیں ہیں! چلئے۔

نہ آں بیچارہ مے سازی نہ با ما ساختی

یہ بحث طول پکڑ جائے گی۔ اگر ہم تفصیلاً بتائیں کہ وہ اعتراضات کیا ہیں جو علامہ مشرقی کے عقائد سے متعلق ان پر وارد کئے جاتے ہیں۔ اور اِس باب میں وہ کس حد تک قابلِ الزام ہیں۔ اِس بحث کا نہ یہ موقع ہے، اور نہ ہی ہم علامہ صاحب کے وکیل کی حیثیت سے یہ کچھ لکھ رہے ہیں، جہاں تک ہمیں معلوم ہے وہ ان تمام اصولات و محکمات پر ایمان رکھتے ہیں، جن پر ایمان لانے سے ایک شخص مسلمان کہلاتا ہے اور انھوں نے خداوند تعالیٰ کی کسی حلال کردہ شے کو حرام اور حرام کردہ شے کو حلال نہیں قرار دیا۔ اب سوچنے کی صرف اتنی بات ہے کہ اگر اسوقت ان کی کوششوں سے آپ کی ضعیف و ناتواں قوم میں تنظیمی قوت پیدا ہو جائے، تو اس سے مستقبل میں آپ کی قوم کو مجموعی فائدہ پہونچیگا۔

یا یہ چیز موجب ہلاکت ہو جائے گی! ہمیں تسلیم ہے کہ ان کی پیدا کردہ جماعت مسلم مجاہدین کے نقشین معیار پر پوری نہیں اُترتی۔ ان میں بہت سے نقائص ہیں۔ بہت سی خرابیاں ہیں۔ لیکن بہرحال یہ حالت اس حالت سے تو بہتر ہے جس میں آپ کی قوم ان تمام خرابیوں کے ساتھ ساتھ ریت کے منتشر ذروں کی طرح بکھری ہوئی تھی کہ ہوا کا ہر تیز جھونکا اسے جدھر چاہتا اڑا کر لے جاتا تھا۔ کہا یہ جاتا ہے کہ یہ جماعت (اور اس کے ساتھ ہی مسلم لیگ) چونکہ اسلامی معیار پر پوری نہیں اترتی اسلئے یہ اس قابل نہیں ہیں کہ انہیں باقی رکھا جائے۔ لیکن اس اصول کو ذرا اور آگے بڑھائیے اور سوچئے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے مثلاً آپ سب کو یہ تسلیم ہے۔ کہ ہم مسلمان کسی طرح بھی اسلامی معیار کے مطابق مسلمان نہیں ہیں۔ ہماری نمازیں اسلامی معیار کے مطابق نہیں ہیں۔ ہمارے روزے روزے نہیں ہیں۔ ہماری زکوٰۃ زکوٰۃ نہیں۔ ہمارا حج وہ حج نہیں۔ ان کی ظاہری شکلیں اسلامی رہ گئی ہیں۔ روح اسلامی بالکل نہیں رہی۔ اب آپ کے متعین کردہ اصول کے مطابق دنیا کے تمام مسلمانوں کو بھی فنا کر دینا چاہیئے یہ نمازیں بھی (نعوذ باللہ) مٹا دینی چاہئیں۔ یہ روزے بھی باقی نہیں رکھنے چاہئیں۔ یہ زکوٰۃ اور حج کی رسومات بھی ختم کر دینی چاہئیں۔ لیکن اس کی تو آپ بھی کبھی اجازت نہیں دینگے۔ آپ یہی کہیں گے کہ نہیں! ان شکلوں کو ضرور باقی رکھنا چاہیئے اور ان کے باقی رکھنے کے لئے پوری جدوجہد کرنی چاہیئے۔ البتہ کوشش یہ کرنی چاہیئے کہ ان میں اصلاح ہوتی جائے۔ اور ان میں رفتہ رفتہ وہ حقیقی اسلامی روح پھر سے پیدا ہو جائے

ہم بھی یہی چاہتے ہیں۔ ہماری موجودہ جماعتیں واقعی حقیقی اسلامی معیار پر پوری نہیں اترتیں اس لئے کہ یہ لامحالہ انہی مسلمانوں کی جماعتیں ہیں جن کا اسلام ہی اسلام کے معیار پر پورا نہیں اُترتا جن کی نہ صلوٰۃ صلوٰۃ ہے۔ نہ صوم صوم۔ لیکن اس کا علاج یہ نہیں کہ ان جماعتوں کو ہی تباہ کر دیا جائے۔ بلکہ یہ کہ جس طرح آپ اپنی بے روح نمازوں اور بے جان روزوں کو باقی رکھ کر ان میں روح پیدا کرنے کے حامی ہیں۔ ان جماعتوں کو بھی باقی رکھئے اور انہیں اصلاح کرتے جائیے۔ رفتہ رفتہ آپ دیکھیں گے کہ نقائص دور ہوتے جائیں گے اور یہی

جماعتیں اسلامی معیار کے قریب آتی جائیں گی کہ جماعت کسی چیستان کا نام نہیں ہوتا بلکہ یہ تو افراد کا مجموعہ ہوتا ہے۔ پچھلے افراد اپنی مدت معینہ کے بعد ختم ہو جاتے ہیں اور نئے افراد شامل ہوتے جاتے ہیں۔ یاد رکھئے آپ کی قوم انہی جماعتوں کی وجہ سے آج بچ گئی ورنہ ہندو اسے ہضم کر گیا تھا۔ اگر یہ جماعتیں نہ رہیں تو قوم بھی نہ رہے گی اور جب قوم ہی نہ رہے گی تو پھر اصلاح کس کی ہوگی! لہٰذا آج جو شخص ایسی جماعتی زندگی کی تشکیل کی کوشش کرتا ہے اسکی حمایت اور امداد کیجئے کہ اس کی دست و بازو کی قوت دراصل آپ کی قوم ہی کی قوت ہے۔ اس کے برعکس اگر آپ اس پر مصر رہے کہ نہیں! چونکہ یہ جماعتیں اسلامی معیار پر پوری نہیں آتیں اس لئے ان کا تباہ کرنا ہی ٹھیک ہے تو یہ واضح ہے کہ یہ طرز عمل بلاواسطہ نہ سہی بالواسطہ ہندوؤں کی اس سازش کو کامیاب بنانے میں مد ہوگا جس کی رو سے وہ ہندوستان سے مسلمانوں کی جداگانہ ملی ہستی کو فنا کر دینا چاہتے ہیں۔ ذرا وقت کی نزاکت پر تو غور کیجئے یوں سمجھئے کہ محمودیوں کے ایک گاؤں پر چاروں طرف سے مختلف دشمنوں نے حملہ کر دیا ہو جو جدید آلاتِ حرب سے مسلح اور ہر قسم کے فنون جنگ کے ماہر ہوں اور جن سے گاؤں کے پرانے وضع کے سیدھے سادے تو اب بالکل ناآشنا ہوں۔ لیکن ان میں ایک ایسا تجربہ کار فوجی سپاہی ہو جو ان تمام فنون سے واقف اور ان کی خفیہ تدابیر سے آشنا ہو۔ وہ گاؤں کے لوگوں کو اکٹھا کرے اور مدافعت کی تجاویز بتائے۔ اب ایسے وقت میں اگر وہاں یہ سوال پیدا کر دیا جائے کہ نہیں! چونکہ یہ شخص نماز پڑھنا نہیں جانتا اس لئے ہم اس کی بات ماننے کو تیار نہیں ہیں۔ جب تک یہ نماز روزہ کے ضروری مسائل سے واقف نہ ہو۔ اس کے بجائے ہم اپنی مسجد کے ملّا سے کیوں نہ پوچھیں کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ اس کی شکل و صورت بھی متشرع ہے اور مسائل دینیہ سے بھی واقف ہے۔ اس فیصلہ سے ان گاؤں والوں کا کیا حشر ہوگا اس کا خود ہی اندازہ فرما لیجئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بہترین چیز یہی تھی کہ یہ فن حرب کا ماہر سپاہی مسائل دینیہ سے واقف ہوتا۔

اور نماز پڑھانا بھی جانتا۔ یا دوسری طرف وہ ملّا ان فنونِ حرب وضرب کا بھی ماہر ہوتا۔ لیکن جب واقعتاً یہ ایسے نہ ہوں اور وقت آپڑا ہو ایسا نازک کہ چاروں طرف سے دشمن نے گھیر رکھا ہو تو اس وقت ان سشرائط کی تکمیل پر اصرار جن نتائج کا حامل ہو گا ظاہر ہے۔ ذرا غور فرمایئے کہ اس آخری دور میں حکیم الامت حضرت علامہ اقبال رحمۃ سے بڑھکر حقائقِ قرآنی اور مقتضیات شرعیہ کا واقف اور کون ہو سکتا ہے! ان کی نگاہوں سے یہ حقیقت پوشیدہ نہ تھی کہ مسلم لیگ اسلامی جماعتی معیار پر پوری نہیں اترتی اور اسکے ارباب حل وعقد میں قرآنی نقطۂ نگاہ سے کسی قدر خامیاں ہیں مسٹر جناح بھی ان کی نگاہوں کے سامنے تھے اور انکے دیگر رفقار کار بھی۔ بایں ہمہ وہ آخری وقت تک اس جماعت کے ساتھ رہے اور اس کی تائید کرتے رہے آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ اگر اس جماعت میں کوئی چیز اصولِ اسلام کے خلاف ہوتی تو وہ اسکے خلاف لب کشائی میں خاموش رہتے! وہ اقبال کہ جس نے ہندوستان کے سب سے بڑے دینی مرکز کے شیخ الحدیث سے جب ایک ایسی بات سنی جو اصول اسلام کے خلاف تھی تو بلاخوف وخطر اعلان کر دیا کہ

چہ بے خبر ز مقام محمدؐ عربی است

آپ کبھی تصور میں لا سکتے ہیں کہ وہی اقبالؒ اگر جناح کے مسلک میں کوئی ایسی چیز دیکھتا تو نہ صرف خاموش ہی رہتا بلکہ اس کی تائید بھی کرتا جاتا! ظاہر ہے کہ جہاں تک شکل وصورت کے متشرع ہونے کا اور فقہی مسائل سے واقفیت کا تعلق ہے، مسٹر جناح کو مولانا حسین احمد سے کیا نسبت لیکن پھر یہ کیا تھا کہ مولانائے مدنی کو تو اقبالؒ نے ناآشنائے مقام محمدؐ عربی قرار دیدیا اور مسٹر جناح کی قیادت میں لیگ کی حمایت اپنا مسلک اختیار کیا! اس میں یہی راز تھا وہ جانتے تھے، کہ اس وقت گاؤں نرغے میں ہے اور ضرورت ایک ایسے ہی شخص کی ہے جو فنون حرب وضرب کا ماہر ہو، اُس ملّا کی نہیں جو جانتا ہی نہیں کہ مسجد کی چار دیواری کے باہر کیا ہو رہا ہے اس لئے انہوں نے کہہ دیا کہ ؎

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے !
اس کو کیا جانیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام (اقبالؒ)

پھر وہ یہ بھی جانتے تھے وہ کہ قلب و دماغ دونوں کے اعتبار سے علومِ اسلامیہ اور سیاستِ حاضرہ میں دوسرے لوگوں سے کس قدر آگے تھے اگر وہ ذرا سا اشارہ بھی کر دیتے تو مسلمان پروانہ وار ان کے گرد جمع ہو کر ایک الگ جماعت بنا لیتے لیکن انہوں نے اسے بھی قطعاً گوارہ نہیں کیا۔ اور جو جماعت پہلے بن چکی تھی۔ اُس کی تائید و تقویت میں ملّی فلاح کو مضمر دیکھا۔

اس مقام پر ہم یہ بھی واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ہمارا مسلک اندھی تقلید اور شخصیت پرستی بھی ہم اپنے مسلک کو محض اس لیئے برسرِ حق نہیں قرار دیتے کہ حضرت علامہؒ کا بھی یہی مسلک تھا، بلکہ یہ کہ جس مسلک کو ہم علیٰ وجہ البصیرت حق و صداقت کا مسلک سمجھتے ہیں اس میں ہم منفرد نہیں ہیں۔ بلکہ حضرت علامہؒ جیسے آشنائے مقامِ محمدیؐ بھی اسی مسلک کے حامی تھے اور ان کی یہ حمایت بھی علیٰ وجہ البصیرت تعلیمِ اسلامی پر مبنی تھی۔

ہمارا خیال ہے کہ ان تصریحات کے بعد اس باب میں مزید کچھ لکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ البتہ ان سے اثر پذیر ہونے کے لیئے مقدم شرط یہ ہے کہ آپ کو اس امر کا صحیح احساس ہونا چاہیئے کہ اسوقت مسلمانوں پر کس قدر نازک دور گزر رہا ہے، اگر آپ کو اس امر کا احساس ہو گیا تو پھر آپ بھی اسکے سوا اور کوئی راہ صواب نہ دیکھیں گے جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اگر آپ مسلمانوں کے اس نقصان کو نقصان ہی نہ سمجھتے ہوں جو ہندو اور انگریز کی متحدہ سازش سے اُسے پہونچنے والا ہے۔ اور آپ کے نزدیک نقصان کا معیار ہی الگ ہو تو وہ ایک جداگانہ بات ہے نقصان کے جداگانہ معیار کا اندازہ تو اس سے لگایئے۔ کہ ایک بہت بڑے مولوی صاحب بیان فرما رہے تھے کہ "یہ سب الزامات غلط ہیں" کہ کانگریسی ہندوؤں نے مسلمانوں پر مظالم کیے ہیں اور وہ مسلمانوں کی ملی زندگی کو فنا کر دینے کے درپے ہیں۔ یہ واردھا اسکیم اور یہ ہندی اُردو کے

جھگڑے سطحی چیزیں ہیں، ان سے مسلمانوں کی ملّی اور مذہبی زندگی کا کیا بگڑ سکتا ہے! کانگریسی صوبوں میں مسلمانوں کو مذہب کی پوری پوری آزادی حاصل ہے، کیا آپ نے کہیں سنا ہے کہ کانگریسی صوبہ میں کسی مسلمان کو پکڑ کر حکومت نے زبردستی اس کی ڈاڑھی منڈا ڈالی ہو۔ اگر وہ ایسا کریں تو قسم ہے اس ذات کی جس کی قبضۂ قدرت میں میری جان ہے۔ میں سب سے پہلے اس حکومت کے خلاف اعلان جنگ کر دوں" اب اگر ملّی نقصان کے متعلق کسی کا نظریہ یہی یہ ہو تو اس سے تو کچھ کہنا ہی بے سود ہے، ہمارا مخاطب تو وہ طبقہ ہے جو اس امر کا احساس رکھتا ہے کہ ہندوؤں کی یہ غیر محسوس چالیں مسلمانوں کو کس تباہی و بربادی کے غاروں کی طرف لئے جا رہی ہیں۔ جنہیں یہ احساس ہو۔ وہ پھر یہ بھی جان سکتے ہیں کہ مسٹر جناح ہمیں بربادی کی طرف لیئے جا رہے ہیں، یا کسی حفاظت کے مقام کی طرف وفیہا البصائر لقوم یعقلون۔

نقد و نظر

تاریخ مسلم لیگ | از جناب مظہر انصاری۔ بی۔ اے (آنرز)۔ طباعت۔ کتابت اعلیٰ۔ جلد حسین المطلا۔ حجم ۳۵۲ صفحات قیمت دو روپیہ۔ اردو کمپنی۔ حویلی اعظم خان۔ دہلی سے مل سکتی ہے۔

اس مفید کتاب میں غدر کے بعد سے قیام مسلم لیگ تک اور اس کے بعد دستور ۱۹۳۵ء تک کے حالات و کوائف نہایت شستہ پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں۔ کتاب محنت سے لکھی گئی ہے۔ اور اس میں دورِ حاضرہ کی سیاسی کشمکش سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اچھی معلومات کا ذخیرہ یکجا جمع کر دیا گیا ہے۔ یہ داستانِ لیگ کا گویا بابِ اول ہے۔ لیگ کی حقیقی زندگی جو اس دور کے بعد شروع ہوتی ہے اسکی جلد ثانی میں آئیگی۔ لیکن مسائل حاضرہ کے سمجھنے کے لئے چونکہ ان کے پس منظر کے سمجھنے کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے کتاب زیر نظر کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ مولف کی کاوش اعتراف کے قابل ہے۔ اور انکی حوصلہ افزائی ضروری۔

صبحِ اُمید

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں !
آنیوالے دور کی دُھندلی سی اک تصویر دیکھ (اقبالؒ)

سنہ ۱۹۳۰ء کا ذکر ہے۔ مسلمانوں نے ایک مُدّت کی گہری نیند کے بعد کروٹ لی تھی۔ ایک عرصہ کے منجمد خون میں کچھ کچھ روانی کے آثار محسوس ہو رہے تھے۔ ایک زمانہ کے جمود و تعطّل کی برف کی سِلیں حوادثِ زمانہ کی تمازت سے ذرا پگھلنی شروع ہوئی تھیں۔ ایک دشت نا پیدا کنار بیابان میں کھوئے ہوئے قافلہ کے افراد میں اپنی متاعِ گم گشتہ کا کچھ نہ کچھ احساسِ زیاں پیدا ہو رہا تھا لیکن فکر و نظر کی پریشانیوں کے باعث کوئی زندہ و پائندہ راہِ عمل نظر نہیں آتی تھی۔ پاؤں آمادۂ سفر تھے لیکن نہ منزل کا کوئی پتہ تھا۔ نہ نشانِ راہ ہی دکھائی دیتا تھا۔ عوام تو ایک طرف، کشتیٔ ملّت کے پختہ کار ناخدا بھی عام طور پر مخلوط و جدا گانہ انتخاب۔ اور تخصیصِ نشست و نیابت کے سود و زیاں کے پیچ در پیچ مسائل میں اُلجھ رہے تھے اُنکے مطالبات، مذہبی اور ثقافتی تحفظات کی حدود میں گھر کر رہ چکے تھے۔ اور اُن کی نگاہیں جمہوری نظامِ حکومت کی بظاہر درخشندہ اُفق پر جا کر رُک چکی تھی۔ بالعموم یہ وہ حضرات تھے۔ جنہیں فطرت نے صرف "دانشِ برہانی" عطا فرمائی تھی، وہ دانش جو محض احوال و ظروف کے ایال و عواطف اور حوادث و واقعات کے تجارب و مشاہدات سے استنباطِ نتائج کے بعد ہی کسی فیصلہ پر پہونچا سکتی ہے۔ اِس سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ لیکن اِس محشرستانِ انتشار و تشتت میں اللہ کا ایک ایسا بندہ بھی موجود تھا جسے مبداءِ فیض کی کرم گستری نے دانشِ برہانی کے ساتھ "دانشِ نورانی" کی متاعِ گراں بہا سے بھی سرفراز فرمایا تھا۔ یعنی وہ دانش جو قرآن کریم کے حقائق و معارف پر تدبّر و تفکر سے ایک مردِ مومن کی نگاہوں میں وہ بصیرت پیدا کر دیتی ہے جس سے وہ ان نفسیاتی کیفیات کا مشاہدہ کر لیتا ہے جنسے اقوام و ملل کے مقدرات کے ستارے بنتے اور بگڑتے ہیں۔ اور ان مشاہدات سے اسکے آئینہ ادراک میں آنے والے دور کی ایک "دھندلی سی تصویر" نظر آ جاتی ہے۔ اسکی نگہِ دور رس

آشیانہ[1] کی نظر فریب پائداری کے بجائے اِس شاخ کی نزاکت پر ہوتی ہے جس پر وہ آشیانہ استوار ہوتا ہے اِسلئے وہ عام لوگوں کی طرح کبھی خوش آئند الفاظ کے سحر سے مسحور اور بلند آہنگ دعاوی کے شور سے مرعوب نہیں ہوتا۔ اسکی نگاہ حقائق پر ہوتی ہے اور وہ اپنی حقائق کی دُوربین سے پردۂ افلاک کے پیچھے چھپے ہوئے حوادث کا نظارہ کرتا ہے۔

ہاں! تو اِس ہنگامہ زارِ انتشار و خلفشار میں یہ مردِ مومن، جسے قسامِ ازلی نے اس قسم کی روشن بصیرت سے نوازا تھا۔ اٹھا، قافلہ کے چند بکھرے ہوئے افراد کو یکجا جمع کیا۔ اور کہا کہ آؤ! تمہیں بتاؤں کہ قرآن کریم نے تمہاری منزل کون سی متعین کر رکھی ہے، اور ہندوستان کے احوال و ظروف کے پیشِ نظر اس منزل تک پہونچنے کے لیے کون سی صراطِ مستقیم ہے اپنے گرد و پیش کے حالات کا تجزیہ کیا۔ اور اس کے بعد کہا کہ:-

> اِس سے ظاہر ہوگیا کہ ہندوستان جیسے ملک میں ایک ہم آہنگ "کل" کی تشکیل کے لیے بلند سطح کی فرقہ پرستی بالکل ضروری اور ناگزیر ہے، برعکس یورپین ممالک کے۔ ہندوستان میں جماعتی تشکیل کی بنا جغرافیائی حدود نہیں۔ ہندوستان ایک ایسا برّاعظم ہے جس میں مختلف النسل۔ مختلف اللسان۔ مختلف المذاہب انسانوں کی جماعتیں آباد ہیں۔ اُنکے نظریۂ زندگی کی بنا کسی مشترک نسلی شعور پر نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ہندوؤں میں کوئی ایسی جماعت نہیں ہے، جسکے مختلف افراد میں فکر و نظر کی یکسانیت ہو۔ ہندوستان میں یورپین اُصولوں کے مطابق جمہوریت کی تشکیل نہیں ہوسکتی جب تک یہاں مختلف فرقوں کی جُداگانہ ہستی کو تسلیم نہ کرلیا جائے۔ لہٰذا مسلمانوں کا مطالبہ بالکل حق بجانب ہے، کہ ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہند (MUSLIM INDIA) کو معرضِ وجود میں لایا جائے......

---

[1] تمہاری تہذیب اپنے ہاتھوں سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا۔ ناپائیدار ہوگا! (اقبالؒ)

"..... میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قایم کی جائے۔ ہندوستان کو حکومت خود اختیاری زیرِ سایہ برطانیہ ملے۔ یا اس سے باہر، کچھ بھی ہو۔ مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔.......

ہندوستان دُنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی مُلک ہے۔ اس مُلک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے۔ مسلمانانِ ہند کے اس زندہ اور جاندار طبقہ میں کہ جس کے بل بوتے پر یہاں کی فوج کا راج قائم ہے، باوجودیکہ برطانیہ نے ان سے کبھی منصفانہ سلوک نہیں کیا، اگر یوں ایک مرکزیت قائم کر دی جائے تو یہ آخر الامر نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ایشیا کی گتھیاں سلجھا دے گا..... یہ مطالبہ مسلمانوں کی اس دلی خواہش پر مبنی ہے کہ انہیں بھی کہیں اپنے نشوو ارتقاء کا موقعہ ملے۔ اسلیئے کہ اس قسم کے مواقع کا حاصل ہونا اس وحدتِ قومی کے نظامِ حکومت میں قریب قریب ناممکن ہے جس کا نقشہ ہندو اربابِ سیاست اپنے ذہن میں لیئے بیٹھے ہیں۔ اور جس سے مقصد وحید یہ ہے کہ تمام مُلک میں مستقل طور پر انہیں کا غلبہ اور تسلط ہو....."

(خطبہ صدارت حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ بتقریب سالانہ اجلاس مسلم لیگ الٰہ آباد منعقدہ ۱۹۳۰ء)

یہ ایک نئی آواز تھی جو ہندوستان کی فضا میں غلغلہ انداز ہوئی۔ یہ ایک انوکھا نصب العین تھا جو ہندی مسلمانوں کے سامنے رکھا گیا۔ نیا اور انوکھا اسلیئے کہ مسلمان صدیوں کی غلامی سے یہ بھول ہی چکا تھا کہ قرآن کریم کی رُو سے ایمان و اعمالِ صالحہ کا فطری نتیجہ استخلاف فی الارض ہے اور مسلمان دنیا میں صرف اسلیئے زندہ ہے کہ وہ خدا کی اس وسیع و عریض زمین پر حکومتِ خداوندی قائم کرے۔ چونکہ یہ آواز کانوں کو بالکل نامانوس معلوم ہوئی۔ اس لیے کسی نے اسے درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ کسی نے یہ کہہ کر

ٹال دیا کہ یہ ایک شاعر کے عالمِ تصور کے حسین خواب ہیں۔ کوئی یہ سمجھ کر ہنس دیا کہ یہ ایک فلسفی کے طُرفہ زا دماغ کی اُپج ہے جو ہندوستان کو ایک ملک نہیں بلکہ مجموعہ ممالک قرار دیتا ہے، جو یہاں کے باشندوں کو ایک قوم نہیں بلکہ مختلف اقوام کا مجموعہ خیال کرتا ہے جو مسلمانوں کو ایک اقلیت نہیں بلکہ مستقل بالذات جُداگانہ قوم گردانتا ہے۔ جو اس بیسویں صدی میں جمہوری نظامِ حکومت کو ہندوستان کے لیے ناقابلِ عمل ٹھہراتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جو ہندوستان کے دو ٹکڑے کر کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں مستقل طور پر حدِّ فاصل قائم کرنا چاہتا ہے۔

اس نے یہ سب کچھ سُنا اور ایک خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ خاموش ہو گیا۔

وقت گزرتا گیا۔ حالات بدلتے گئے۔ ابھی دس برس بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ واقعات نے یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا کہ سیاستِ ہند کی گتھیوں کا حل سوائے اس کے اور کچھ نہیں جو ۱۹۳۰ء میں اس "دیدہ بینائے قوم" نے پیش کیا تھا (رحمہ اللہ تعالیٰ)، آج یہ مسائل ایک ایک کر کے واضح اور بیّن طور پر سامنے آ چکے ہیں کہ ہندوستان ایک ملک نہیں بلکہ مجموعہ ممالک ہے، مسلمان ایک فرقہ نہیں بلکہ جداگانہ قوم ہیں ہندوؤں اور مسلمانوں کی سیاسی کشمکش کا تصفیہ فرقہ وارانہ انداز پر نہیں بلکہ بین الاقوامی حیثیت سے ہو سکتا ہے بنا بریں مغربی انداز کا نظامِ جمہوریت یہاں قابلِ عمل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ان امراض کا واحد علاج تقسیمِ ممالک ہے، آج اس کے لیے گوشے گوشے سے آوازیں بلند ہو رہی ہیں مختلف اسکیمیں اور تجاویز پیش ہو رہی ہیں۔ ہر شخص اسی نہج پر سوچتا اور اسے طریقِ عمل کو جادۂ مستقیم سمجھتا ہے۔ حتیٰ کہ خود ہندوؤں کا وہ طبقہ جو اپنے آپ کو فریب میں مبتلا نہیں رکھنا چاہتا۔ وہ بھی تسلیم کرتا ہے۔ کہ ہندی مسائلِ سیاست کا حل اس کے سوائے اور کچھ نہیں۔ مثلاً مسٹر این۔ سی۔ دت (سابق رکن آل انڈیا کانگریس کمیٹی) اپنے ایک مراسلہ میں لکھتے ہیں:۔

اُن حالات میں میرا خیال ہے کہ ہندو مسلم قضیہ کا حل یہی ہو گا کہ ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کو دو قومیں سمجھ لیا جائے۔ اور پھر دو قوموں کی حیثیت سے ان کے ساتھ ایک متحدہ قومیت کا خیال ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دل سے نکال دیا جائے، مسٹر جناح نے حال ہی میں گاندھی جی کو جواب دیتے ہوئے متحدہ قومیت کے تصور کو سراب کے لفظ سے

تعبیر کرکے جس خیال کا اظہار کیا ہے وہ میرے خیال میں اب نہیں تو کل حقیقت ہو کر رہے گا بہر حال اگر یہ چیز بھی جلد طے ہو جائے تو کچھ بُرا نہیں۔ یوگوسلاویہ کے کروٹ اور سرب کی طرح اگر ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں میں بھی بحیثیت فرقہ کے نہیں، بلکہ بحیثیت دو قوموں کے سمجھوتہ ہو جائے اور مسلم اکثریت کے علاقوں میں ہندو اکثریت کے علاقے مداخلت نہ کریں۔ اور ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمان مداخلت نہ کریں۔ تب بھی ہندوستان کا اجتماعی مفاد محفوظ رہ سکتا ہے میرا خیال ہے کہ اب ہمیں پاکستان کے خیال سے ڈرنا نہ چاہیے۔ البتہ اس میں مناسب ترمیم و اصلاح کرکے اُسے اپنے حسب حال بنانے کی کوشش کرنی چاہیے"۔ (مدینہ یکم فروری ۱۹۴۰ء)

اس میں شبہ نہیں کہ حوادثِ زمانہ کا ستایا ہوا مسلمان بضعفِ عزیمت و شدتِ انتشار کی وجہ سے ہنوز اپنے بازوؤں میں وہ قوت محسوس نہیں کرتا جو ان چٹانوں کو ریت کے ذرّوں میں تبدیل کر دے جو اس کی منزل کے راستے میں حائل ہیں لیکن جب اُس نے اپنا نصب العین متعین کر لیا ہے اور اُس کے دل میں اپنے نصب العین تک پہنچنے کا عزم راسخ ہو چکا ہے تو ان عارضی حوادث و موانع سے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ آپ اسی نہج پر قدم اٹھاتے چلئے چند دنوں کے بعد آپ دیکھ لینگے کہ توفیقِ ایزدی راسی مرد راہ بین علیہ الرحمۃ کے الفاظ میں،

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائیگی

اسقدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار
نگہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائیگی

آ ملینگے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائیگی

پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائیگی

نالۂ صیاد سے ہونگے نوا ساماں طیور
خونِ گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائیگی

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے
(اقبال ۱۹۱۲ء)

یادِ اقبال

(جنابِ آسی ملتانی)

نہیں اٹھتی کوئی پُر درد صدا تیرے بعد   ہوگیا قافلہ محرومِ درا تیرے بعد
جسکی فریاد سے نیندوں میں خلل پڑجائے   نہیں ایسا کوئی آشفتہ نوا تیرے بعد
نظر آتے ہیں بدن زندگیوں کے مدفن   پھر یہاں کون کرے حشر بپا تیرے بعد
فلسفہ خاک بسر ہی ترے اٹھ جانے پر   شاعری ہو ہمہ تن آہ و بکا تیرے بعد
نہ رہا عقل و جنوں میں وہ توازن قائم   علم پھر عشق سے بیگانہ ہوا تیرے بعد
غلطی پر جو کوئی ٹوکنے والا نہ رہا   کھو گئے بو لہبی میں علماء تیرے بعد
انکے پردوں سو گزر سکتی ہو اب کسکی نظر؟   مطمئن پھرتے ہیں اربابِ ریا تیرے بعد
ہو کوئی محوِ کلیسا، کوئی وارفتۂ دیر   محرمِ رازِ حرم بن نہ سکا تیرے بعد
یہ بھی ہو تیری نواؤں کا اثر جسکے سبب   قبلہ رُو "رہبرِ فرزانہ" ہوا تیرے بعد
یہ صداقت کا کرشمہ ہے کہ تیرا پیغام   جذب و تاثیر میں کچھ اور بڑھا تیرے بعد

تیرے ہوتے جسے کہہ دیتے تھے شاعر کا خیال
قوم کا قبلۂ مقصود بنا تیرے بعد

شخصیت پرستی

از جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز

اسلام کا نصب العین یہ تھا کہ وہ انسان اور خدا کے درمیان براہِ راست تعلق پیدا کر دے۔ ایسا تعلق کہ عبد و معبود کے درمیان کوئی دوسرا واسطہ نہ رہے۔ انکے درمیان کوئی دوسری قوت حائل نہ ہو۔ نبی اکرم تشریف لائے اور اپنی عدیم النظیر تعلیم اور فقید المثال عمل سے بتا دیا کہ اس بلند ترین تخیل، اس زرّیں نصب العین کو کس طرح عمل میں لایا جا سکتا ہے چنانچہ حضور کا مشن ان شاندار الفاظ میں بتایا گیا۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ ۭ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ۝

کہو کہ میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے۔ تمہارا معبود ایک ہی ہے پس اسی کی طرف سیدھی راہ اختیار کرو۔ اور اس سے مغفرت مانگو۔ اور مشرکین کے لیے بڑی ہی خرابی ہے۔

اور اسی کی تفسیر تھی جو پیکرِ اسلام جناب عمرؓ نے وادی ضجنان میں گزرتے وقت فرمایا اللہ اکبر! یہ وہ وادی ہے جس میں ابن خطاب اونٹ چرایا کرتا تھا۔ اور باپ کی سخت گیری برداشت کیا کرتا تھا۔ اور آج اس رب العزت کا اتنا فضل ہے کہ عمرؓ اور اسکے خدا کے درمیان کوئی دوسری طاقت حائل نہیں۔ اس سے مراد محض سلطنت و حکومت کی طاقت ہی نہ تھی بلکہ ہر وہ طاقت جو انسان کے قلب و دماغ پر مستولی ہو کر اُسکے اور اسکے خدا کے درمیان حاجب و دربان بن جاتی ہے۔

لیکن ہر دقیق نظریہ کی طرح یہ نظریہ تھا بڑا لطیف اور یہ ہر حقیقت عظمیٰ کے مانند یہ حقیقت تھی بڑی غیر محسوس، محسوسات کا خوگر انسان، کہ جسکے سجدہ ہائے جبینِ نیاز بسیط سے بسیط حقیقتِ مجردہ کو بھی لباسِ مجاز میں دیکھنے کے لیے رقصاں و جنباں رہتے ہیں، اس غیر محسوس تعلق سے زیادہ عرصہ تک کیف اندوز نہ ہو سکا اور

اُسنے وہ تمام پردے ایک ایک کر کے پھر سے گرا دیئے جو اسلام سے پیشتر اُسکے اور اسکے خدا کے درمیان حائل تھے اور جنھیں نبی عربیؐ نے ایک ایک کر کے اُٹھا دیا تھا۔ قرآن کریم نے بڑی شرح وبسط سے اِن تمام مقامات کو ایک ایک کر کے گِنا دیا تھا، جہاں سے یہ پردے قلب ودماغ اور سمع وبصر پر گرا کرتے ہیں، لہٰذا جب تک قرآن حمید آنکھوں کے سامنے رہا کسی کی مجال نہ ہوئی کہ ان پردوں کو پھر سامنے لاسکے کہ چراغ کا روشن ہونا ہی اِس بات کے لیئے کافی ہے کہ اندھیرا وہاں نہ آسکے لیکن جب قرآن مہجور ہوگیا۔ جب بنی اسرائیل کی طرح اِس نورِ مبین کو پس پُشت ڈال دیا گیا۔ تو وہی کچھ ہوا جو ہوتا چلا آتا تھا۔ کہ فطرت کے قوانین اٹل اور اُسکا دستور غیر متبدل ہے وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا۔ آیئے ان مختلف پردوں، اور اُنکے حسین وجمیل نقش ونگار کی سیر کریں جو عقیدت وارادت کے رنگوں سے مزین اور اطاعت وقناعت کے جواہر سے مرصع ہیں۔ اِس لیئے کہ جب تک آپ اِن نظر فریب پردوں کی اصلیت سے واقف نہ ہوجائینگے اِس حقیقتِ عظمیٰ تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ جو صدیوں سے اُنکے اندر لپٹی ہوئی ہے اور بے نقاب ہو کر جنت نگاہ نہیں بن سکی۔

رسول پرستی! خدا کے بعد ماننے والوں کے نزدیک ہمیشہ رسول کی ہستی اشرف ترین مخلوق ہوتی ہے لہٰذا اگر انسانوں میں سے کسی کو خدا کی جگہ دیئے جانے کا احتمال ہوسکتا ہے تو سب سے پہلے وہ رسول ہی کی ہستی ہوسکتی ہے۔ اممِ سابقہ کی روش اِس باب میں جو کچھ رہی ہے اسپر قرآن تفصیلی روشنی ڈالتا ہے، وہ فطرتِ انسانی کے اِس کمزور پہلو سے واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کس طرح حضرات انبیاء کرام خدا بنائے گئے اسکے بیٹے قرار دیئے گئے۔ الوہیت وابنیت کی مقدس چادر اُڑھا کر انہیں مافوق البشر منوایا گیا۔

قرآن کریم اس خطرناک چور دروازہ کو سیسہ پلائی ہوئی دیواروں سے بند کرنا چاہتا تھا۔ آپ کسی سورت کو دیکھئے۔ لفظاً معناً مجملاً تفصیلاً۔ اِس غلط عقیدہ کے ہر گوشہ کی تردید اس میں موجود ہوگی یعنی قرآن کریم میں جس درجہ خدا کی توحید پر مختلف عنوانات سے زور دیا گیا ہے اسی درجہ رسولوں کی بشریت بھی متنوع اعتبارات سے بے نقاب کی گئی ہے انھیں بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ کہا گیا۔ (۶:۴۱) انھیں خدا کا عبد کہا گیا۔ وہ ہدایت بھی کرنے

تھے تو اپنے مالکِ حقیقی کے حکم سے ہی کرتے تھے۔

وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْهِمْ فِعْلَ الْخَیْرٰتِ وَ اِقَامَ الصَّلٰوةِ وَ اِیْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَ كَانُوْا لَنَا عٰبِدِیْنَ (۲۱:۷۳)

اور ہم نے ان کو امام و پیشوا بنایا جو لوگوں کو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے۔ اور ہم نے ان کو نیکی کرنے، نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کی وحی کی۔ اور وہ سب ہماری عبودیت اختیار کئے ہوئے تھے

وہ خود خدا کے دروازے کے بھکاری ہوتے تھے۔

فَقَالَ رَبِّ اِنِّیْ لِمَاۤ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ (۲۸:۲۴)

اور موسیٰ نے کہا کہ پروردگار! آپ جو کچھ بھی بہتری میرے لیے بھیجیں میں اس کا محتاج ہوں۔

انھیں اپنی ذات تک کے لیے نفع و نقصان کا اختیار نہ ہوتا تھا۔

"تم کہہ دو کہ میں اپنی ذات کے لیے بھی کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتا۔ مگر جو اللہ چاہے اگر میں غیب کے امور سے واقف ہوتا تو میں بہت سے منافع حاصل کر لیا کرتا۔ اور کوئی مضرت مجھ پر واقع نہ ہوتی۔ میں تو صرف ایمان والوں کے لیے نذیر و بشیر ہوں" (۷:۱۸۸)

جو وحی ان پر نازل ہوتی تھی وہ خود اس پر ایمان لاتے تھے۔ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ وَ اَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ۔ اور اس کی اتباع کرنے پر اسی طرح مامور تھے جس طرح اور ماننے والے۔ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤى اِلَیَّ۔ (۱۵: ۱۰) ہر چند اللہ تعالیٰ نے اپنے حفظ امن میں لے کر ان کو ایسا بنایا تھا کہ ان سے معصیت کا سرزد ہونا ممکن ہی نہ تھا۔ لیکن ان کی بشریت و عبودیت کو پختہ ترین طریق پر واضح کرنے کے لیے یہاں تک بھی فرما دیا۔ کہ بفرض محال اگر یہ بھی شرک و معصیت کریں تو ان پر بھی اسی طرح عذاب ہوگا جس طرح دوسرے انسانوں پر (۱۲:۲۶ ; ۱۵: ۱۰) بلکہ ان کو عام لوگوں سے دگنا عذاب ہوگا۔

"اگر (بفرض محال) ہم تمہیں ثابت قدم نہ رکھتے تو تم ان کی طرف کچھ نہ کچھ جھک پڑتے۔ اور اس صورت میں ہم تمہیں اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی دگنا عذاب دیتے۔ اور کوئی ہمارے خلاف تمہارا مددگار نہ ہوتا۔ (۱۷:۷۵)

کفار اعتراض پر اعتراض کرتے کہ رسول بھی ہمارے ہی جیسے انسان کیوں ہوں لیکن قرآن بار بار

اس بات پر زور دیئے جاتا کہ ہاں وہ انسان ہی ہیں، اور انھیں انسان ہی ہونا چاہیئے تھا۔ وہ عام انسانوں کی طرح کھاتے پیتے تھے۔ اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے۔

"اور کہتے ہیں کہ اس رسول کو کیا ہوا ہے کہ یہ کھانا بھی کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا بھی ہے۔" (۲۵:۷)

جواب ملتا ہے کہ:۔

"ہم نے تم سے پہلے بھی جسقدر رسول بھیجے وہ سب کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے بھی تھے ..." (۲۵:۲۰)

اور پھر عام انسانوں کی طرح۔ اپنے وقت پر مدت حیات ختم کرکے اس دنیا کو چھوڑ جاتے تھے۔

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّن قَبْلِكَ الْخُلْدَ ۖ أَفَإِن مِّتَّ فَهُمُ الْخَالِدُونَ ﴿٢١:٣٤﴾	اور ہم نے تم سے پہلے کسی بشر کے لیئے ہمیشہ رہنا تجویز نہیں کیا۔ پھر اگر تم انتقال کر جاؤ گے تو کیا یہ ہمیشہ رہیں گے۔

البتہ اُن کی علمی بصیرت۔ حقائق و معارف کے اس اُفقِ اعلیٰ پر ہوتی ہے، جہاں عام انسانوں کی نگاہ تک نہیں پہنچ سکتی۔ اُنکے مزکّیٰ و مقدس نفوس کی روحانیت کائنات کے اُس معراجِ کمال پر ہوتی ہے جہاں عام انسانوں کے شہپرِ تخیّل کے بھی پر جلتے ہیں۔ اُنکے قلب و دماغ کی یہ بلندیاں اپنی نظیر آپ ہوتی ہیں اس لیئے کہ وہ تمام نوعِ انسانی کے لیئے ایک نمونہ بنا کر بھیجے جاتے ہیں۔ بایںہمہ وہ ہوتے انسان ہی ہیں۔ بشریت کے حدود سے خارج نہیں ہوتے۔ خدا کے عبد ہی ہوتے ہیں۔ خود معبود نہیں ہوتے اور جیسا کہ شروع میں کہا گیا ہے آتے اسلیئے نہیں کہ انسانوں کو اپنی غلامی اور عبودیت سکھلائیں بلکہ اسلیئے کہ اپنی تعلیم و عمل سے انسانوں کو خدا کی ایسی عبودیت اور غلامی سکھائیں کہ جس سے تمام دنیا کی غلامی کے طوق و سلاسل اُتر جائیں

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ	کسی انسان کو یہ بات زیبا نہیں کہ خدا اسے کتاب و حکمت و نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ خدا کو چھوڑ کر میرے

كُونُوا عِبَادًا لِّي مِن دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِن كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنتُمْ تَدْرُسُونَ (۳:۷۹)

بندے بنجاؤ۔ بلکہ وہ یہی کہے گا کہ تم اللہ والے بنجاؤ۔ کہ تم کتاب سکھانے بھی ہو اور پڑھتے بھی ہو۔

حضورؐ خاتم النبیین ہوکر تشریف لائے۔ اور اس مقصد رسالت کو اس انداز سے پورا کیا کہ آپ کے بعد نہ کسی اور پیغام کی ضرورت باقی رہی۔ اور نہ اس پیغام پر کسی نئے عمل کرکے دکھانے والے کی کہ یہ پیغام ازلی۔ بصورت سرمدی قرآن کی دفتین میں محفوظ و مصؤن چلا آتا ہے کہ باطل اسکے پاس تک نہیں پھٹک سکتا۔ اور اس پیغام پر عمل، ان نقوش قدم کے ذرّے ذرّے سے آفتاب کی طرح روشن اور زندہ ہے۔ جن نقوش صراط مستقیم کے نشان ادھر سے اُدھر تک سیدھے ملتے چلے جاتے ہیں۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔

لیکن ذرا غور کیجیے کہ مسلمانوں نے اپنے رسولؐ کے ساتھ کیا کیا! کیا وہی نہیں جس سے روکنے کے لیے حضورؐ تشریف لائے تھے۔ یہ احمد بے میم (احد) یہ عرب بلاعین (رب) یہانتک کہ ؎

وہی مستوی عرش ہے خدا ہوکر!

اُتر پڑا وہ مدینہ میں مصطفیٰ ہوکر

وہ جنکے متعلق خدا کا ارشاد تھا کہ اپنے نفع و نقصان کے بھی مالک نہیں۔ بلکہ خدا کے محتاج ہیں۔ انھیں تمام دنیا کے نفع و نقصان کا مالک و مختار قرار دیدیا۔ انھیں (معاذاللہ) خدا بنا دینا نہیں تو اور کیا ہے؟ خدا کے عبد کو خدا کہنا عجیب توحید ہے۔ جب اعتراض کیا جائے تو کہہ دیتے ہیں کہ صاحب یہ سب عشق و محبت کی سرمستیاں ہیں، انسان سب کچھ اپنے محبوب ہی کو سمجھتا ہے، عوام کے جذبات عقیدت کو جوش میں لانے کے لیے فی الواقع یہ جواب معقول نظر آتا ہے لیکن سوال صرف اتنا ہے کہ اُمم سابقہ نے جو اپنے رسولوں کو خدا بنا لیا تھا تو کیا بغض و عناد کی بنا پر بنایا تھا؟ وہاں بھی یہی غلوِ محبت ہی تو تھا۔ جنے ان کے محبوب کو وہ کچھ بنا دیا جسے قرآن کریم نے شرک قرار دیا۔ بغض و عناد اور نفرت سے کبھی کسی نے رسولوں کو خدا نہیں بنایا۔ تو کیا پھر یہ دلیل پر لطف نہیں کہ جو کچھ پہلی امتوں نے کیا، وہ شرک۔ اور اگر وہی کچھ۔ اسی جذبہ کے ماتحت مسلمان کریں۔ تو عین توحید ہے! ایک

رہی بیج ایک ہی درخت سے دو مختلف پھل لینا فطرت کا مذاق اُڑانا ہے۔ اس میں کسے کلام ہے کہ حضورؐ کی محبت ایک مسلمان کے لیے متاعِ حیات ہے۔ ایسی محبت جو ماں باپ۔ اولاد اموال۔ بلکہ خود اپنی جان کی محبت سے بھی زیادہ ہو اور حقیقت یہ ہے کہ جب تک محبت نہ ہو اتباع کامل ہو نہیں سکتا۔ جس عمل کی محرک آتشِ عشق ہو اس کا ایک لمحہ سو سال کے ٹھنڈے پانی سے وضو کردہ سرد نمازوں سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے کہ یہ صرف سر جھکاتا ہے اور وہ سر کٹاتا ہے یہ زندہ رہنا چاہتا ہے کہ موت کے بعد کا کھٹکا مٹ جائے۔ اور وہ مرتا ہے کہ زندگی کسی پر سے نچھاور ہو کر ٹھکانے لگے اُسے بھی حشر نشر حساب کتاب کے جھگڑے درپیش ہوتے ہیں۔ اور اُس کی یہ حالت کہ تمیز ہی نہیں کیا جا سکتا کہ تلوار رگِ جاں سے پہلے چھوئی تھی یا جان بابِ جنت سے ؎

عشق نے اک جست میں طے کر دیئے قصے تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں (اقبالؒ)

لیکن صہبائے عشق کی سرمستیوں میں حفظِ مدارج و مراتب بھی قرآن ہی نے سکھایا ہے۔ جو پی کر بہک گیا۔ وہ خمخانۂ یثرب کا متوالا ہی نہیں۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ جنت کی شراب میں سب کچھ ہے لیکن نشہ نہیں۔ پر لہٰذا۔ خدا خدا ہے، اور رسول رسول۔ اور رسول کا رتبہ یہی ہے کہ ؎

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر!

اس سے آگے بڑھنا بھی اتنا ہی گناہ ہے جتنا اس سے پیچھے ہٹنا۔ کہ اسلام لانے کے لیے، جہاں خدا کے لیے لا الٰہ الا اللہ کی شہادت کی ضرورت ہے، وہاں محمدؐ کے لیے عبدہٗ و رسولہٗ کی شہادت کی بھی اور یہی ایمان و محبت کی صحیح تصویر ہے اس تصویر کے صحیح رُخ کے لیے دورِ رسالتؐ اور صحابہ کبارؓ کا طرزِ عمل دیکھیے حضورؐ کی عمر بھر یہی تعلیم و تلقین رہی کہ اپنے آپ کو عام انسانوں سے بلند حیثیت نہ دیں۔ اور اپنے ماننے والوں کے قلب و دماغ پر خدا بنکر نہ چھا جائیں۔ اسکے لیے حضورؐ نے ان میں حریتِ فکر و نظر کی ایسی روح پھونکی کہ آج اس مزعومہ جمہوریت کے دور میں بھی اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ معاملات میں مشاورت، صحابہؓ کا کئی ایک مواقع پر حضورؐ کی رائے سے اختلاف اور اختلاف کی کامل آزادی، حضورؐ کی رائے کے متعلق تحقیق استفسار کہ آپ نے وہ رائے یا حکم منصبِ رسالت دیا ہے یا ذاتی حیثیت سے یہ سب اس چیز کا آئینہ دار ہے

کہ حضورؐ ایک عبدِ مومن میں کس درجہ انسانیت کی آزادی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اور ایک کا غلام بنا کر کس طرح دُنیا بھر کی غلامی سے نجات دلانا چاہتے تھے۔ یہی تھا وہ ماحول جس میں عقلِ انسانی نے صحیح نشوونما پائی۔ اور جس انسان کو خدا نے اس طرح پیدا کیا تھا کہ وہ حیوان کی طرح سر جھکا کر نہ چلے۔ وہ فی الحقیقت اس قابل ہو گیا۔ کہ دُنیا میں سر اُٹھا کر چلے۔ اسلام انسان کو یہی سربلندیاں اور سرفرازیاں بخشنے آیا تھا۔ اور یہی اُس دینِ فطرت کی خصوصیت تھی ہم نے جب یہ خصوصیت کھو دی تو پھر وہیں جا گرے جہاں سے اُبھرے تھے۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ۔ کس قدر صحیح حقیقت ہے۔

ائمہ پرستی | رسولوں کے بعد عوام کی عقیدت کے مرکز مذہبی پیشوا اور دین کے ائمہ ہوتے ہیں قرآن کریم نے اُمم سابقہ کے کوائف و حالات سے ہمیں بتا دیا کہ رسولوں کے بعد یہی لوگ ہیں جن کو خدا کا درجہ دیا جاتا ہے چنانچہ فرمایا:۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۹ : ۳۱)	ان لوگوں نے خدا سے ورے ہی اپنے مذہبی علما، پیشوایان دین کو خدا بنا لیا۔

اس کے متعلق جب نبی اکرمؐ سے عرض کیا گیا کہ حضورؐ! یہود و نصاریٰ کبھی اپنے احبار و رہبان کو سجدے تو نہیں کیا کرتے تھے" تو حضورؐ نے فرمایا کیا یہ لوگ اس چیز کو حلال نہیں سمجھتے تھے، جسے وہ حلال بتا دیں" اور اسے حرام جسے وہ حرام کہہ دیں؟ یہی ارباباً من دون اللہ بنانا ہے یعنی جو منصب و حیثیت خدا کے لئے ہے وہ اُن لوگوں کو دے دیں۔ یہی اُن کی پرستش ہے" اِس سے معلوم ہوا کہ ائمۂ مذہب کی پرستش یہ ہے کہ:۔

(۱) ان کے فیصلوں کو خدا کے فیصلوں کی جگہ دیدی جائے" اور

(۲) ان کے ارشادات کو تنقید سے بالاتر سمجھا جائے۔

اُممِ سابقہ نے ایسا کچھ اس لئے کیا تھا کہ اُن کی آسمانی کتابوں کے اجارہ دار و محافظ اُن کے مذہبی

راہ نما تھے۔ لوگ رشد و ہدایت کے لیئے اُنکے محتاج تھے، چاہیئے یہ تھا کہ لوگ اُنکے فیصلوں کیلئے کتاب کی سند مانگتے۔ لیکن انھوں نے ایسا نہ کیا بلکہ جو کچھ ان اراکین مذہب نے کہہ دیا اسے بھی فرمودۂ الٰہی سمجھ لیا ظاہر ہے کہ عوام ان کے فیصلوں کو اسی لیئے خدا کا فیصلہ سمجھتے تھے کہ اُنکے نزدیک وہ فیصلے خدا کے احکام کے مطابق ہوتے تھے یعنی وہ ایسا باور کر لیتے تھے۔ رفتہ رفتہ حالت یہ ہوگئی کہ لوگ خدا کے فیصلوں سے بے نیاز ہو گئے اور اپنی احبار و رہبان کو خدا کا قائم مقام سمجھ لیا۔ اب اُنکا ہر حکم وحی منزل کی طرح واجب التسلیم اور اُنکا ہر فیصلہ آیت الٰہی کی طرح بالاتر از تنقید قرار دیا گیا اسی کو قرآن کریم نے شرک قرار دیا ہے۔

قرآن کریم نے فرمایا:۔

قُلْ إِنَّ الْهُدَىٰ هُدَى اللَّهِ (۳:۷۳) ہدایت وہی ہے جو اللہ کی ہدایت ہے۔

لہٰذا قرآن ہی کی اتباع واجب ہوئی پھر:۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو واضح مفصل اور تعمت حاصل کرنے کے لئے آسان بنا دیا کہ اسکے سمجھنے کے لیئے کوئی خاص "برہمنوں" کی جماعت ہی مختص نہ ہو جائے۔

(۴) پھر قرآن کریم کی حفاظت کی ذمہ داری بھی خود اللہ نے لے لی کہ قیامت تک اس میں نہ رد و بدل ہو سکے نہ ترمیم و تنسیخ۔

ان بدیہیات سے ظاہر ہے کہ دین کا تقاضا ہی کہ ہر زمانہ کے مسلمان۔ قرآن کریم کی روشنی کے ماتحت عقل صحیح سے کام لے کر صراط مستقیم پر چلتے جائیں۔ خود بخود منزل مقصود تک پہنچ جائیں گے۔ ان کو راستہ میں اندھوں کی طرح لاٹھی کی ضرورت ہی نہیں کہ روشنی بھی موجود ہے اور بینائی بھی لیکن غور سے دیکھئے کیا ہم واقعی اس روش پر چل رہے ہیں؟ عوام کو تو چھوڑ دیجئے۔ کہ اوّل تو وہ قرآن کریم کا صرف بس اتنا ہی جانتے کہ یہ قسم اٹھانے کے کام آتا ہے، اور اگر ان میں سے بعض قرآن پڑھتے بھی ہیں تو ویسے کہ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ۔ صرف الفاظ کی تلاوت کرتے ہیں۔ خواص۔ کہ جو مذہب کے واحد اجارہ دار بنے بیٹھے ہیں۔ اُن کی یہ حالت ہے کہ کسی معاملہ کے متعلق دینی فیصلہ پوچھیے۔ بتا دینگے کہ فلاں امام نے

اسکے متعلق یہ فرمایا ہے۔ فلاں علامہ کی یہ رائے ہے نسفی میں ایسا لکھا ہے شارح وقایہ کا یہ خیال ہے غرضیکہ اُن کی سند کسی نہ کسی انسان تک جا کر رہ جائیگی۔ اس سے آگے نہیں بڑھ سکے گی۔ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِنَ الْعِلْمِ کہیں خدا کا نام نہیں۔ کسی جگہ قرآن کا ذکر نہیں، اور اعتراض کیجئے تو جھٹ کہہ دیں گے کہ میاں! ان حضرات (علیہم الرحمۃ) نے بھی تو قرآن پڑھ کر ہی ایسا لکھا ہے اُن سے بڑھ کر کون قرآن کو سمجھ سکے گا؟ غور فرمایئے! اس جواب میں۔ اور اس میں جو یہود و نصاریٰ اپنے احبار و رہبان کے متعلق دیتے تھے۔ کیا فرق رہ جاتا ہے۔ کیا انھوں نے اُن کو اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ایسا ہی کچھ سمجھ کر نہیں بنایا تھا۔

معاملہ یوں ہوا کہ جب اسلامی سلطنت قائم ہوئی تو سلطنت کو لامحالہ تدوین قانون کی ضرورت لاحق ہوئی۔ اسلام میں چونکہ دین و دُنیا الگ الگ شعبے نہیں۔ اس لیئے یہ قانون بھی مذہب ہی کی روشنی میں مُرتب ہونا تھا۔ علماء عظام اور آئمہ کرام (علیہم الرحمۃ) کہ جن کو اللہ نے قلب و دماغ کا نُور عطا فرمایا تھا۔ جمع ہوئے اور وقت کی ضروریات کو سامنے رکھ کر قانون کے ضابطے مُرتب کیئے۔ یہ ضابطے سرکاری توثیق سے مستند کر کے عدالتوں میں بھجوا دیئے گئے کہ مقدمات کے فیصلے اِنہی کے مطابق ہوا کریں۔ ظاہر ہے کہ جب کسی آئینی حکومت کے ضوابط قانون مُرتب ہو کر نافذ العمل ہو جائیں تو پھر سوائے حکومت کے اور کسی کو جائز نہیں ہوتی کہ وہ بھی قانون مُرتب کر سکے یا اُن میں ترمیم تنسیخ کر سکے بعینہٖ جس طرح سرکاری ٹکسال کے بعد کسی کو سکہ رائج الوقت بنانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ یہ تھی فقہ کی ابتدا اور یوں دوسروں کو ایک ہی فقہ کے مطابق فیصلے کرنے پر مکلف اور اس میں کمی بیشی یا ردّ و بدل کرنے سے منع کیا گیا تھا۔ لیکن اس سے ظاہر ظاہر ہے کہ:

(۱) نہ تو حضرات فقہاء قیامت تک کا علم رکھتے تھے۔ کہ ہر زمانہ کی ضرورتوں کے مطابق ایک ہی وقت میں مکمل قانون وضع کر دیں +

(۲) نہ وہ (نعوذ باللہ) خدا ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ کہ وہ استنباط مسائل میں اپنے نتائج کو تنقید سے بالاتر قرار دیدیں +

زمانہ کی ضرورتوں کے لحاظ سے ان قوانین میں تبدیلی کا ہونا بھی ضروری تھا۔ اور اس قانون پر کسی معیارِ اعلیٰ (قرآن کریم) کی روشنی میں تنقید بھی کی جا سکتی تھی۔ لیکن سلطنت نے جس بناء پر دوسروں کو قوانین میں رد و بدل کرنے (بالفاظ دیگر مزید اجتہاد) سے روکا تھا۔ وہ علت تو نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ اور بعد میں آنے والوں نے سمجھ لیا۔ کہ بس اب تدبر و تفکر کا دروازہ باب نبوت کی طرح بند ہوگیا قرآن جتنا سمجھا جانا تھا۔ سمجھا جا چکا۔ اِس سے جو کچھ حاصل کیا جا سکتا تھا حاصل کر لیا گیا۔ اب اسکا وجود تبرکاً دنیا میں رہے تو رہے۔ عملی حیثیت سے اُمت اس سے بے نیاز ہو چکی۔ اسکے پڑھنے سے ثواب تو ضرور ملتا ہے لیکن اسکا سمجھنا دین پر اضافہ کرنا ہے نتیجہ اسکا ظاہر ہے کہ رفتہ رفتہ قرآن حکیم جیسی زندہ اور زندگی بخش کتاب منتروں کا مجموعہ بنکے رہ گئی۔ جس سے جھاڑ پھونک گنڈہ تعویذ کا کام لیا جا سکے۔ یا زیادہ سے زیادہ اُس کی ادبی اور لسانی لطافتوں پر بحث کر کے اسے الفاظ کا گورکھ دھندا سمجھ لیا جائے۔ کیا یہی تھی وہ غرض جس کے لیے قرآن کریم کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لی تھی۔

تدوین فقہ کا تعلق معاملات کی دُنیا تک ہی تھا۔ اگر باب اجتہاد بند ہونا ہی تھا تو وہ اسی حصہ تک بند ہوتا لیکن آہستہ آہستہ دین کے قصرِ مشید کا ہر ایک دروازہ اور کھڑکی بند کر دی گئی۔ حقائق و معارف پر بھی دبیز جالا تقلید۔ چھا گئی۔ حتیٰ کہ نوبت بانجا رسید کہ دین سے قطع نظر دیگر علوم و فنون میں بھی جو کچھ سلف نے لکھ دیا قولِ فیصل اور حرفِ آخر سمجھ لیا گیا۔ اب زمانہ کچھ کہے آپ کی بصیرت کا تقاضا کچھ ہو۔ آپ نہ اسکے خلاف نہ اس سے زیادہ کچھ سمجھ سکتے ہیں جو سمجھا جا چکا۔ اور نہ کہہ سکتے ہیں جو کہا جا چکا۔ نہ سر میں دماغ اپنا ہو سکتا ہے نہ سینے میں آپ کا دل اپنا۔ نہ دیکھنے کیلئے آپ کی اپنی آنکھیں نہ سننے کیلئے کان۔ اُولٰئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ دُنیا کہیں سے کہیں چلی گئی۔ لیکن اُمت مسلمہ کی سطح فہم و ادراک جو ہزار سال پہلے تھی وہی آج ہے ؎

وہ تیری گلی کی قیامتیں کہ لحد کے مردے اُکھڑ گئے!

یہ میری جبینِ نیاز ہے کہ جہاں دھری تھی دھری رہی

غور تو کیجئے کیا یہ سلف کی پرستش نہیں! یہ ان کو احبار و رہبان کی طرح خدا کا درجہ دینا نہیں!!

کیا ان کی نگاہ کو قیامت تک کے آنے والے واقعات کا مبصر اور تمام حالات و کیفیات کا واقف سمجھنا اور ان کے فیصلوں کو تنقید سے بالاتر قرار دینا انھیں خدائی صفات کا حامل سمجھنا نہیں؟ اللہ تعالیٰ نے اللہ والے (ربانیین) بننے کے لیے قرآن کریم کو ہی معیار قرار دیا تھا۔ (۳: ۷۸) اس نے قرآن کریم کو نازل فرما کر اس کی تبیین و تفصیل بھی اپنے ذمہ لے لی تھی۔ کہ لوگ اس باب میں بھی دوسروں کے محتاج ہو کر ان کی عبودیت اختیار نہ کرلیں۔

الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۔ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ۔ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّ بَشِيْرٌ (۲-۱۱)	ایسی کتاب کہ جس کی آیات محکم بنائی گئی ہیں پھر اس کے ساتھ انھیں صاف بھی بیان کی گئی ہیں خدائے حکیم و خبیر کی طرف سے تاکہ تم اللہ کے سوا کسی اور کی عبدیت اختیار نہ کرو (اور) میں تم کو اس کی طرف سے آگاہ کرنے اور بشارت دینے کے لیے آیا ہوں

پھر یہ بھی دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ اس دین کی غرض کیا بتلاتا ہے جو نبی اکرمؐ کے واسطہ سے دنیا تک پہونچا۔ سورۂ جاثیہ کے دوسرے رکوع میں سلسلۂ کلام یوں شروع ہوتا ہے کہ اللہ نے بنی اسرائیل کو کتاب و حکمت و نبوت عطا فرمائی اُن کو دیگر اقوام عالم پر فضیلت عطا کی، اور انھیں دین کی بینات بھی دی گئیں لیکن انھوں نے علم آجانے کے بعد باہمی ضد اور ہٹ سے اختلافات پیدا کرلیے اُنکے اختلافات کا تو قیامت میں فیصلہ کر دیا جائیگا لیکن دُنیا کو تو ضرورت تھی کہ خدا کا وہ دین جو انسانی اختلافات کی نذر ہو کر مسخ ہو چکا تھا پھر سے دُنیا کو مل جائے اس کے لیے۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۱۸: ۴۵	پھر ہم نے تمہیں (اے رسولؐ) دین کی ایک شریعت پر مبعوث کیا۔ پس اس کا اتباع کرو۔ اور ان لوگوں کے خیالات کا اتباع مت کرو جنکو علم نہیں ہے۔

یہ دین و شریعت کہاں ہے اس کا جواب بھی وہیں ہے، کہ:

هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (۲۰: ۴۵)	یہ (قرآن) ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لیے بصیرت ہے اور ایمان والوں کے لیے ہدایت و رحمت۔

قرآن ہر زمانہ کے انسانوں کے لیئے بصائر ہے۔ اس میں بار بار غور و فکر۔ تدبر و تفحص کی تاکید کی گئی ہے جو ایسا نہیں کرتے، اُن کو کہیں شر الدواب کہا گیا۔ کہیں کالانعام بتایا گیا جہنم اُن سے بھری گئی ان کے قلوب پر مُہریں، اُن کی آنکھوں پر پردے، اور اُنکے کانوں میں ڈاٹ بنائے گئے۔ کیئے جو کتاب اس طرح عقل و بصیرت کو دعوت دیتی ہو اور جس کے لانے والے کا سب سے پہلا دعویٰ یہ ہو ادعُوا اِلیٰ اللہ علیٰ بصیرۃ انا و من اتبعنی اس کتاب میں کورانہ تقلید کی کہاں گنجائش ہے جمود و تعطل وہ کب روا رکھ سکتی ہے۔ قرآن انسانوں کو ظلمت سے نکالکر نور کی طرف لے جانے کے لیے آیا تھا۔ لیکن آنکھیں بند کر کے بیٹھا رہنے والا تو خواہ ظلمت میں ہو خواہ نور میں یکساں ہے علم اجتماعی حیثیت سے قوموں میں وراثتہً منتقل ہوتا اور قومی سرمایہ کی طرح بڑھتا رہتا ہے لیکن، جو قوم علم کی کسی خاص سطح کو منتہائے کمال سمجھ کر فارغ ہو بیٹھے۔ اسکا مآل معلوم۔ چنانچہ وہ قوم جو دُنیا میں تمام نوع انسانی کی امامت کے لیئے آئی تھی ہمیشہ دُنیا کے پیچھے پیچھے رہنے کی عادی ہو گئی۔ وہ ملت جس کے ہاتھ میں اس قدر عظیم الشان قندیل دی گئی تھی کہ اس کی روشنی مشرق و مغرب کے امتیازات مٹا کر اقصائے عالم کو منور کرنے والی تھی۔ اب ہر جگنو کو شمع رُاہ سمجھ کر اسکے پیچھے لپکنے کی خوگر ہو گئی۔ یہ راستہ آسان تھا۔ اس میں سہل انگاری اور آرام طلبی تھی۔ اجتہاد کے لیئے ذہنی جہاد اور اسکے ساتھ ساتھ جسمانی مجاہدے کی ضرورت تھی۔ تقلید میں اس کی کوئی ضرورت نہ تھی جس کو باپ دادا کے ورثہ سے ریاست ملجائے۔ وہ خود محنت کیوں کرے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس وراثت میں سکہ ان کو وہ ملے جو اصحاب کہف کے سکہ کی طرح صدیوں پہلے کا ہو۔ درحقیقت تقلید اختیار ہی وہ قوم کرتی ہے جس میں مجاہدانہ روح باقی نہ رہے ہر قوم کی تاریخ ہمیں ایسا ہی بتاتی ہے۔ خود قرآن کریم اسپر شاہد ہے +

تم سے پہلے (بھی) کوئی رسول کسی بستی میں نہیں آیا کہ وہاں کے خوش حال (آرام طلب)
لوگوں نے یہ نہ کہہ دیا ہو کہ ہم نے اپنے آبا کو ایک طریق پر پایا اور ہم انہی کے نشانات
کا اقتدا کرتے چلے جا رہے ہیں" (۴۳:۲۳)

لیکن یہ یاد رہے کہ اُس مکافات عمل کے دن کہ جب "سمع و بصر و قلب" ہر ایک سے الگ الگ

بازپرس ہوگی۔ آپ یہ کہہ کر نہیں چھوٹ سکیں گے کہ ہم نے فلاں امام کی تقلید کی تھی۔ فلاں عالم کا اتباع کیا تھا۔ متبوع حضرات آپ کے اس اتباع سے ہی انکار کر دینگے کیونکہ انھوں نے کبھی کسی کو ایسے اتباع کا حکم نہیں دیا تھا۔

"جسوقت وہ لوگ جو متبوع تھے اپنے متبعین سے بیزار ہو جائینگے۔ اور سب عذاب کا مشاہدہ کرینگے۔ انکے باہمی تعلقات سب منقطع ہو جائیں گے"۔ (۲:۱۶۶)

اسوقت متبعین سے پوچھا جائیگا کہ تم نے جو اُن کی پرستش شروع کر دی۔

"کیا تمہارے پاس پیغمبر بینات لیکر نہیں آئے تھے۔ وہ کہیں گے کہ ہاں آئے تو تھے"۔ (۵۰:۴۰)

اس سے خود سمجھ لیجئے کہ مقصد کیا ہوا۔

ہمارا مطلب یہ نہیں کہ سلف سے جو کچھ تمہارے پاس آیا ہے۔ معاذ اللہ سب گمراہ کن ہے ایسا کون کہہ سکتا ہے مطلب صرف یہ ہے کہ جو کچھ تمھیں ان سے ملا ہے۔ آنکھیں بند کر کے اسکی پیروی نہ کرو۔ بلکہ شمع قرآنی کی روشنی میں ہمیشہ آنکھیں کھلی رکھو۔ وہ بھی تمہاری ہی طرح کے انسان تھے۔ غلطی کر سکتے تھے لیکن قرآن کی کسوٹی کبھی غلطی نہیں کر سکتی۔ جو اس کسوٹی پر پورا اترے۔ دین وہی ہے اور بس۔ وَذٰلِکَ دِیْنُ الْقَیِّم

اسلاف پرستی کی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ ہم سمجھ لیتے ہیں کہ ہم تو غلطی کر سکتے ہیں لیکن ہمارے بزرگوں سے غلطی کا امکان نہیں تھا لیکن آپ اس دلیل کو ذرا آگے لے جایئے تو اس کی حقیقت خود بخود بے نقاب ہو جائیگی یعنی ہم اپنے آپ کو غلطیوں سے منزہ نہیں قرار دیتے لیکن ہمارے بعد کے آنیوالے ہمیں اپنا اسلاف سمجھیں گے اور اسلاف سمجھ کر یہ عقیدہ قائم کر لینگے۔ کہ ان اسلاف سے تو غلطی نہیں ہو سکتی تھی البتہ ہم غلطی کر سکتے ہیں۔ اور اسی طرح یہ سلسلہ آگے بڑھتا جائیگا یقین مانیئے! ہمارے اسلاف بھی ہماری طرح یہی کہتے تھے کہ ہم منزہ عن الخطا نہیں ہیں لیکن یہ بعد کے آنے والے تھے جنھوں نے انہیں منزہ عن الخطا قرار دے کر انکے ہر فیصلہ کو وحی آسمانی کی طرح تنقید کی حدود سے بالاتر قرار دیدیا۔ امام یوسف رح کا قول ہے "کہ کسی شخص کے لیے ہمارے کسی قول کی اتباع جائز نہیں تا وقتیکہ وہ ہمارے ماخذ کو نہ جان لے"۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص ہم کو بلا حجت لیتا ہے اس کی مثال رات کے اندھیرے

میں لکڑیاں چننے والے کی سی ہے کہ ہوسکتا ہے کہ وہ لکڑی کی جگہ سانپ پر ہاتھ ڈال دے"۔ امام مالکؒ کا ارشاد ہے کہ "میں بھی انسان ہوں۔ میری رائے صائب بھی ہوتی ہے اور غلط بھی"۔ امام احمدؒ کا قول ہے کہ "انسان کی ناسمجھی کی بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ دین کو اشخاص کے ہاتھ میں دیدے"۔ وقس علیٰ ذالک۔ یہ حضرات وہ ہیں جنہیں اجتہادِ تامہ کا درجہ حاصل تھا۔ جب وہ اپنے آپ کو معصوم عن الخطاء نہیں سمجھتے تھے تو تا بدیگراں چہ رسد لیکن بعد میں آنے والوں نے انہیں ہر طرح کی خطا، سہو اور غلطی سے معصوم سمجھ کر اُنکے اقوال کو پیغامِ خداوندی قرار دے دیا۔ اور یہاں تک کہہ دیا کہ "چاروں اماموں کے فیصلہ کے بعد ہمیں آنکھیں بند کر لینی چاہئیں"۔ امام شافعیؒ کی خود یہ کیفیت تھی کہ ایک سال ایک فیصلہ دیتے تھے لیکن دوسرے سال مزید تفقہ و تدبر سے اسے منسوخ قرار دیدیتے تھے۔ لیکن ان کے بعد انہی ائمہ کی تقلید کرنے والوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ "انسانی آراء واقوال تو ایک طرف ہر وہ آیت جو ہمارے مسلک کے خلاف جائے یا ماؤل ہے یا منسوخ"۔ یعنے قرآن کریم کو بھی ان حضرات کے مسلک کے تحت رہنا ہو گا۔ اگر کوئی آیت قرآنی اُنکے مسلک کے خلاف جائے گی تو یا تو اس کی ایسی تاویل کر لی جائے گی کہ وہ اس مسلک کے مطابق اُتر آئے اور اگر اس کی ایسی تاویل نہ ہو سکے تو سمجھ لیا جائے گا کہ وہ آیت منسوخ ہے! اللہ اکبر! خدا کے احکام انسانی فیصلوں کی رُو سے منسوخ قرار دیئے جائینگے۔

پھر مسلمان صدیوں سے تخریب و تشیع فرقہ بندی اور گروہ سازی کی جس مشرکانہ زندگی سے گزر رہا ہے (کہ قرآن کریم دین میں تفرقہ اندازی کو صریح الفاظ میں شرک قرار دیتا ہے)، غور سے دیکھئے تو اسکی تہ میں بھی اسلاف پرستی ہی کا جذبہ کارفرما نظر آئے گا۔ ہونے کو فرعی معاملات میں اختلاف کہاں نہیں ہوتا اور تو اور خود صحابہ کبارؓ میں بعض مسئلوں میں ذاتی طور پر اختلاف تھا۔ حضرات ائمہ کا یہ عالم تھا کہ امام ابوحنیفہؒ کے شاگردانِ رشید امام یوسفؒ و امام محمدؒ سینکڑوں مسائل میں اپنے استاذ سے اختلاف رکھتے تھے۔ باایں ہمہ ان ذاتی اختلافات کی بنا پر وہ حضرات کوئی نیا دین۔ کوئی جداگانہ فرقہ نہیں بنا لیتے تھے لیکن بعد کے آنے والوں نے جب اسلاف پرستی شروع کی اور ایک مخصوص مسلک کے متبعین نے سمجھ لیا

ہمارے مسلک کے لوگ سب منزہ عن الخطاء تھے تو لازمی طور پر یہ بھی ماننا پڑا کہ اس مسلک کے خلاف چلنے والے بدیہی طور پر غلطی پر ہیں۔ یہی کچھ مخالف مسلک والوں نے سمجھا۔ نتیجہ اسکا بعینہٖ باہمی ضد اور ہٹ کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ اور یہی ضد اور ہٹ ہے جسے قرآن کریم اختلاف آرائی اور تفرقہ انگیزی کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ اور اسکے بعد (کل حزب بما لدیھم فرحون) کے مطابق ہر شخص یہ سمجھ لیتا ہے کہ جس فرقے سے میں متعلق ہوں وہ "ناجی" اور باقی سب جہنمی ہیں اس کی تمام جدوجہد اس غرض کے لیے ہوتی ہے کہ اس فرقہ کو برسر حق اور دوسروں کو باطل پرست ثابت کر دے۔ نہ اس میں تحقیق کا مادہ باقی رہتا ہے۔ نہ حقائق کو خالی الذہن ہو کر پرکھنے کی صلاحیت۔ وہ اپنے مسلک کے خلاف ایک لفظ سننا بھی گوارا نہیں کرتا۔ اس لیے نہیں کہ اسکے پاس اپنے مسلک کی حقانیت کے محکم دلائل ہوتے ہیں۔ بلکہ اسلیئے کہ وہ اگر اپنے مسلک میں کسی غلطی کا امکان تسلیم کرے۔ تو اس سے اُسے اپنے اسلاف کیا بھی غلطی کا امکان ماننا پڑے گا۔ اور یہ وہ چیز ہے جسے تسلیم کرنے کے لیے وہ ایک لمحہ کے لیئے بھی تیار نہیں اس سے اسکے "دین" کی فلک بوس عمارت زمین پر آگرتی ہے۔

پھر آپ دیکھیں گے کہ یہ اختلافات بہت چھوٹی چھوٹی باتوں میں ہوتے ہیں ایسی معمولی باتوں میں کہ آپ سنیں تو حیران رہ جائیں کہ یہ کونسا ایسا معاملہ ہے جس پر یوں آستینیں چڑھائی جائیں لیکن ان حضرات کے سامنے چونکہ زندگی کا کوئی صحیح مقصد نہیں۔ دین کا کوئی واضح نصب العین نہیں۔ اسلیئے وہ اختلافات کی ان حد بندیوں کی حفاظت ہی کو ذریعہ نجات سمجھے ہوئے ہیں۔ اور انکا تحفظ ہی اُنکے نزدیک عین جہاد ہے۔ ایک دفعہ دیکھنے میں آیا کہ ایک بہت بڑے مولوی صاحب کا نہایت پر شکوہ جلوس جا رہا ہے۔ "غازی اعظم زندہ باد" کے فلک شگاف نعروں سے زمین دہل رہی ہے مسرت کے شادیانے بج رہے ہیں۔ خوشی کی لہریں دوڑ رہی ہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ان صاحب نے کسی مجلس مناظرہ میں امام ابو حنیفہؒ کی شان میں سوء ادبی کے کلمات کہے اسپر مقلدین حضرات نے ان پر مقدمہ چلایا۔ مقدمہ نے طول کھینچا۔ سزا ہوئی۔ لیکن اپیل میں بری ہو گئے۔ اور اب فاتحانہ انداز سے مظفر و منصور حریم راجعت فرمائے وطن شریف ہو رہے ہیں آپ ان روح فرسا مناظر کو دیکھ کر بے شک ہنس دیجئے۔

لیکن ان کی اہمیت ان حضرات سے پوچھیے۔ انکے نزدیک تو عاقبت سنوارنے کا ذریعہ ہی یہی ہے اور یہ سب کچھ اسلیئے کہ اسلاف پرستی نے درحقیقت خدا پرستی کی جگہ لے رکھی ہے۔ جو کچھ خدا کے لیئے ہونا چاہیئے تھا وہ سب اسلاف کی عظمت و عقیدت کے لیئے ہو رہا ہے۔

پھر ایک اور بات بھی بڑی دلچسپ ہے ظاہر ہے کہ فقہی احکامات و مسائل دراصل ان قوانین کا نام ہے جو اسلامی سلطنت کی طرف سے نافذ ہوتے تھے۔ سلطنت تو ایک مدت ہوئی ختم ہو چکی لیکن ان قوانین کے فرعی اختلافات کی جنگ برابر جاری ہے۔ ان حضرات کی عمران اختلافات سے متعلق بحث و جدل میں گزر جاتی ہے لیکن کبھی ایک لمحہ کے لیئے بھی اس بات کی فکر نہیں ہوتی کہ اس قوت کے پیدا کرنے کی بھی کوئی تجویز کی جائے جس کی بنا پر ان قوانین و احکام کو منوایا جائے گا۔ اور حق یہ ہے کہ جس قوم کے قوائے ذہنی و عملی پر اس درجہ تعطل و جمود چھا جائے وہ کشمکش حیات سے اسی طرح گریز کیا کرتی ہے اور یہ نفس انسانی کی شعبدہ کاریاں ہیں کہ وہ اس فرار کو بھی جہاد بنا کر دکھا دیتا ہے۔

یہ تو ائمہ فقہ اور علماء سلف کی تقلید و اتباع سے متعلق تھا۔ ائمہ پرستی میں ان کے علاوہ ایک اور جماعت بھی ہے لیکن وہ ہمارے اس موضوع سے خارج ہے اس لیئے کہ وہ اپنے ائمہ حضرات کو معصوم اور مامور من اللہ مانتے ہیں۔ اور اس امامت کو ایک خاندان میں مقید و محدود سمجھتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جس شخص کو فہم قرآن اس عقیدے کی اجازت نہ دے اسکے نزدیک تو یہ عقیدہ سرتاسر نسل پرستی بن کے رہ جاتا ہے اور یہ ایک ایسا بنیادی اور اصولی فرق ہے جس کی وجہ سے ہمارا ان حضرات سے تخاطب ہی بے معنی ہے۔ (باقی)

نوابُ آفُ ممدوٹ کی تبادِل اسکیم

موسوم بہ

کانفیڈریسی آف انڈیا

یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ اِسلام صرف چند عقائد اور رسومات ہی کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک جامع نظام ہے اور مسلمان بعض اسکے نہایت ضروری اجزاء کو ترک کیے بغیر دوسری قوموں کے ساتھ مطلق طرِیق پر اشتراکِ عمل نہیں کرسکتے۔ خواہ یہ اشتراکِ عمل ایک ماتحت قوم کی حیثیت سے ہو خواہ ایک ہی مُلک میں رہنے والی ہمسایہ قوم سے، دوسری قوموں کے ساتھ ملکر نظام حیات کی ترتیب کے معنے یہ ہونگے کہ وہ اسلام کے حقیقی نظام کی بجائے ایک مخلوط نظام قائم کریں جو اکثر اُمور میں احکام شریعت کے خلاف ہوگا۔

ہر چند یہ حقیقت اِسلام کا اصل الاُصول تھی لیکن اسلامی طریق فکر و نظر پر عجمی تکلفات نے ایک عرصہ سے ایسے پردے ڈال رکھے تھے۔ کہ یہ حقیقت نگاہوں سے بالکل اوجھل ہو چکی تھی ہمارے اس دور میں مبداء فیض نے اپنی عین کرم گستری سے حکیم الاُمّت حضرت علامہ اقبالؒ کو جو اس پُرآشوب زمانہ میں اسلام کا "دیدہ بینا" تھے وہ نگہ بصیرت عطا فرمائی۔ جسے اس امر کو نہایت وضاحت سے محسوس کیا۔ اور انھوں نے اپنی گرانمایہ زندگی کا ایک ایک لمحہ اِسی جہاد میں صرف کر دیا۔ کہ مسلمانوں کے سامنے یہ بھولا ہوا سبق پھر سے آجائے۔ اُنھوں نے آخری وقت تک مسلمانوں کو احکام و نوامیس ہی پر کاربند ہونے کی تلقین کی۔ اور اس مقصد کی تحصیل کے لیے ہدایت فرمائی ہے کہ

بانشہ درویشی در ساز و دما دم زن !

چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن

اس "سلطنتِ جسم" کی حقیقت اربابِ نظر پر مخفی نہیں لیکن جن اُمور پر علامہ مرحوم نے سب سے زیادہ زور دیا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان اپنی ملی خصوصیات سے دستبردار ہوئے بغیر دوسری قوموں کے ساتھ امتزاج نہیں پیدا کر سکتے۔ اور نہ اُنکے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ کسی غیر قوم کے محکوم رہ کر خواجہ یثرب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سچے پیرو کہلا سکیں۔

آج جب کہ اسلام کی یہ مایہ ناز ہستی جسکے فیضان سے تمام دُنیائے اسلام مستفیض ہے عالمِ حیات سے روپوش ہو چکی ہے۔ ہم یہ حقیقت اور بھی زیادہ وضاحت سے محسوس کر رہے ہیں یہی نہیں بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے سابقہ ایکہزار سال کے تعلقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انکا باہمی امتزاج ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ اور اب اسلامیانِ ہند کے لیے اسکے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ برادرانِ ہنود سے علیحدہ ہو کر امن و عافیت کا ایک نیا مسکن تلاش کریں جس میں ان کی تہذیب اور تمدن درست طور پر نشو و نما پا سکیں اور ان کے سیاسی و اقتصادی مفادات کو کوئی نقصان پہنچے یہ مسکن کیا ہے ؟ پاکستان! یہ وہ پاک سرزمین ہے جس کے ساتھ ہماری بہترین توقعات وابستہ ہیں اس کی طرف جو راستہ بھی جائے جادۂ حرم کی طرح عزیز اور متبرک ہے۔ اور جو افرادِ گرامی ان راستوں کی طرف ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ اُن کی کوششیں لائق صد تحسین ہیں

"کانفیڈریسی آف انڈیا" اِن متعدد راستوں میں سے ایک ہے جو اس سلسلہ میں قوم کے بیدار مغز افراد کی طرف سے پیش کیے گئے ہیں۔ "کانفیڈریسی" اس حکومت کو کہتے ہیں جس میں متعدد دول شامل ہوں۔ یہ دول ایک دوسرے کے ساتھ تھوڑا بہت ربط ضرور رکھتی ہیں لیکن یہ ربط اس قدر شدید نہیں ہوتا کہ وہ اپنی انفرادی ہیئت کو اجتماعی ہیئت میں مدغم کر دیں۔ اگر ان میں کامل اتحاد و یگانگت کا جذبہ کار فرما ہو تو ایسی حکومت "فیڈریشن" کے نام سے موسوم ہو گی۔ جسکا نمونہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں پیش کیا گیا۔ ایسی حکومت کے لیے ضروری ہے کہ متعلقہ دول کو ایک دوسرے پر پورا پورا اعتماد ہو اور وہ مرکزی حکومت کو زیادہ سے زیادہ اختیارات ودیعت کرنے پر آمادہ ہوں۔

ہندوستان کی دو سرکردہ اقوام یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے پر اعتماد

نہیں۔ ان کے تمدنی، سیاسی اور اقتصادی مفادات ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریباں ہیں جو بات ایک کے لیے زہر ہے۔ وہ دوسری کے لیے تریاق اور جو ایک کے لیے نیش ہے وہ دوسری کے لیے نوش ہے اسلئے اس کش مکش پیہم کا واحد علاج علیحدگی میں مضمر ہے۔

زمانہ اس پر شاہد ہے کہ سرمایہ دار طبقوں کو اپنی دولتمندی کے سبب ہمیشہ دوسرے طبقوں پر غلبہ حاصل رہا ہے، وہ اپنے تمول کی وجہ سے تمام اعلیٰ مناصب اور ذرائع اثر پر قبضہ جما لیتے ہیں اور دوسرے طبقوں کو اسباب ترقی سے محروم رکھتے ہیں، چنانچہ فرانس۔ برطانیہ۔ اور امریکہ میں سالہا سال سے یہودیوں کے چند خاندانوں کا غلبہ رہا ہے اور جرمنی میں بھی عرصۂ دراز تک عنانِ اقتدار یہودیوں ہی کے ہاتھ میں رہی ہے گو ظاہرا طور پر حکومت ان قوموں ہی کے ہاتھ میں رہی ہے، چنانچہ یہودیوں کے یہ خاندان اپنے سرمایہ کے زور سے ممالک مغرب کی سیاسی۔ اقتصادی اور معاشرتی زندگی کے ہر شعبہ پر چھائے ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ انکے رضا و منشار کے بغیر کوئی سیاسی پارٹی حکومت قائم نہیں کر سکتی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ نپولین کی شکست کا سبب اس کی فوجی طاقت کا انحطاط نہ تھا بلکہ محض یہودی سرمایہ داروں کی مخالفت تھی جس نے اہل فرانس کو مالی حیثیت سے بالکل قلاش اور بے دست و پا بنا دیا۔ اسی طرح جنگِ عظیم میں جرمنی کو میدانِ جنگ میں شکست نہیں ہوئی بلکہ بنکوں میں شکست ہوئی جن پر یہودی سرمایہ داروں کا قبضہ تھا۔ جنگ کے بعد بھی یہودی المانی حکومت اور زندگی کے ہر شعبہ پر مسلط تھے اور جرمنوں کے لیے ترقی کرنیکا کوئی امکان نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہر ہٹلر کو یہودیوں کے اخراج کی ضرورت محسوس ہوئی۔

بعینہٖ یہی حالات ہندوستان میں بھی رونما ہو رہے ہیں۔ ہندو سرمایہ دار ہیں اور مسلمان محنت پیشہ۔ ہندو صنعت و حرفت۔ تجارت تعلیم۔ اور ملازمت غرضیکہ زندگی اور حکومت کے ہر شعبہ پر متصرف ہیں اور مسلمانوں کو ترقی کرنے کا کوئی موقع حاصل نہیں۔ ہندو تجارت پیشہ ہیں، اور انگریزوں کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم کر کے آڑھت کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان تمام تمتعات کے بعد انکے خوانِ نعمت کے بچے کھچے ٹکڑے۔ تنگدست مفلوک الحال اور جاں بلب مسلمانوں کو نصیب ہوتے

ہیں ملازمتوں میں بھی ہندوؤں ہی کا اجارہ قائم ہوگیا ہے، اسکے سبب مسلمان سرکاری صیغوں میں بار حاصل کرنے سے معذور ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلمانوں کی تعداد کم ہے اور ہندوؤں کی تعداد زیادہ۔ غرضیکہ جس پہلو سے دیکھا جائے مسلمان اپنے ترقی یافتہ ہم وطنوں کا مقابلہ کرنے سے معذور ہیں۔ یہ نہیں کہ اِن میں مقابلہ کی اہلیت نہیں۔ بلکہ مختلف واقعات کی وجہ سے ایک ایسی صورتِ حالات پیدا ہو چکی ہے جس کی وجہ سے وہ اُنکے مقابلہ سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتے۔ نہ ان کے پاس مال و زر ہے نہ طاقت۔ اگر وہ کامل طور پر منظم بھی ہوجائیں تو بھی اُنکا ماحول اس قدر سازگار نہیں کہ وہ ہندوؤں کا مقابلہ کرسکیں۔ اُن کی مشکلات کا واحد علاج یہ ہے کہ وہ ایک ایسے آئینی دستور کا مطالبہ کریں جس میں ہندوؤں کا ناجائز غلبہ دُور ہو جائے اور وہ آزادی سے اپنے مقدر کی تشکیل کرسکیں۔ یہ اِسی صورت میں ممکن ہے کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے انہیں ہندو علاقوں سے علیحدہ کردیا جائے۔

اِس امر کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ اگر اسلامی علاقے ہندو علاقوں سے علیحدہ کردیے جائیں، تو بھی مسلمانوں کو ہندوؤں کے ساتھ تھوڑی بہت راہ و رسم پیدا کرنی ضروری ہوگی۔ انھیں اپنے ہمسایہ ہندوؤں کے ساتھ تجارتی اور سیاسی تعلقات قائم رکھنے پڑینگے علیحدگی کا یہ تصور کہ مسلمانوں کا اپنے ہمسایہ ملک یا اُسکے باشندوں کے ساتھ کوئی تعلق نہ رہے گا۔ ایک خیالِ خام ہے کیونکہ پڑوسی ہونے کی حیثیت سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں تھوڑا بہت اشتراکِ عمل ناگزیر ہوگا۔ اگر اسلامی علاقے ہندو علاقوں سے علیحدہ ہوجائیں تو اس سے صرف یہی فرق پیدا ہوگا کہ مسلمان اپنے مفادات کی بہتر نگہداشت کرسکینگے اور ہندوؤں کا غلبہ ان کی بہبود میں خلل انداز نہ ہوگا اسکے علاوہ دو باعزت ہمسایہ قوام کی حیثیت سے اُنکے باہمی تعلقات میں کوئی امر مانع نہ ہوگا۔ چنانچہ اب تک علیحدگی کی جتنی اسکیمیں پیش کی گئی ہیں۔ ان سب میں اِس حقیقت کا اعتراف کیا گیا ہے کہ ہندوستان میں "فیڈریشن" کی بجائے "کانفیڈریسی" کا قیام زیادہ موزوں ہوگا۔ بالفاظ دیگر یہ علیحدگی ایک مکمل عدم تعاون نہیں ہوگی۔ بلکہ ایک ایسی علیحدگی ہوگی جس میں اشتراکِ عمل کے امکانات بھی ہوں گے۔

"کانفیڈرسی آف انڈیا" کے فاضل مصنف "ایک پنجابی (A Punjabi)" نے جو تبادل اسکیم پیش کی ہے اس کی عملی صورت یہ ہے کہ ہندوستان کو تین مختلف علاقوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ یعنی (۱) شمال مغربی مسلم علاقہ۔ (۲) مسلم بنگال اور (۳) ہندو علاقہ اس میں نواب سر محمد شاہ نواز خاں والی ممدوٹ نے جو کتاب مذکور کے ناشر ہیں یہ ترمیم کی ہے کہ ان تین فیڈریشنوں میں ریاستہائے راجستان و دکن کے دو اور فیڈریشن اضافہ کر دیے جائیں۔ اس طرح تمام ہندوستان پانچ فیڈریشنوں میں منقسم ہو جائیگا اور ان سب کے ملا دینے سے ایک متحدہ حکومت قائم ہو گی جس کے مختلف حصص یہ ہیں :-

(۱) شمال مغربی مسلم فیڈریشن جس میں شمال مغربی سرحدی صوبہ۔ سندھ اور پنجاب (ماسوائے انبالہ ڈویژن۔ ضلع کانگڑہ اور ضلع ہوشیار پور کی تحصیل اونہ ڈسنگر گڑھ) بلوچستان کشمیر۔ اور پنجاب کی مسلم ریاستیں۔ یا ایسی ریاستیں جن کی آبادی زیادہ تر مسلم ہے۔ شامل ہوں گی۔

(۲) ریاستہائے حیدر آباد۔ میسور اور ریتار کا فیڈریشن۔

(۳) راجستان کا فیڈریشن جس میں راجپوتانہ اور وسط ہند کی ریاستیں شامل ہوں گی۔

(۴) ہندو فیڈریشن جس میں یو۔پی۔ سی۔پی۔ بہار، اور مغربی بنگال۔ اڑیسہ۔ آسام۔ مدراس بمبئی۔ اور راجستان اور دکن کی متحدہ ریاستوں کو مستثنیٰ کرتے ہوئے دیگر دیسی ریاستوں کے بعض حصص شامل ہوں گے۔

(۵) مسلم بنگال فیڈریشن جس میں مشرقی بنگال کا اسلامی علاقہ۔ آسام کے دو اضلاع گول پڑھ اور سلہٹ۔ ریاست تری پاٹرا اور اسکے علاوہ دیگر دیسی ریاستوں کے وہ حصص جو گول پڑھ اور سلہٹ میں واقع ہیں۔ یا ان دو ضلعوں کے سبب دیسی ریاستوں سے علیحدہ ہو گئے ہیں۔

اس تقسیم سے ہندوستان کے نقشہ میں جو تغیرات لازم آئینگے وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) ایک نیا صوبہ قائم ہوگا جو صوبہ دہلی قسمت انبالہ ضلع کانگڑہ و اونہ گڑھ شنکر کی تحصیلوں (ہر دو واقع ضلع ہوشیار پور) پر مشتمل ہوگا یا ان تمام علاقوں کو صوبہ جات متحدہ میں شامل کر دیا

کر دیا جائیگا۔

(۲) مغربی بنگال کے ہندو علاقوں کو بہار یا اوڑیسہ میں شامل کیا جائے گا۔

(۳) گول پڑھ اور سلہٹ کے اضلاع مشرقی بنگال میں شامل ہونگے۔

(۴) ضلع گول پڑھ کے شمال میں ایک رہ گزر بنایا جائیگا جو آسام کے ہندو علاقہ کو ہندو علاقوں کے فیڈریشن سے وابستہ کرے۔

(۵) ریاست حیدر آباد اور میسور کو ملانے کے لیے ریاستہائے دکن کے فیڈریشن میں ایک رہ گزر بنایا جائے گا۔

(۶) راجستھان فیڈریشن کو ریاست پٹیالہ کے ساتھ ملانے کے لیئے ایک راستہ بنایا جائے گا۔ جسکا کچھ حصہ ہندو علاقہ اور کچھ شمال مغربی مسلم علاقہ سے حاصل ہوگا

ورسے زیر بحث اسکیم کے متعلق مندرجہ ذیل حقائق نہایت وضاحت سے آشکارا ہو جاتے ہیں کہ:۔

(۱) اِس سے موجودہ صوبوں کی سرحدوں میں کوئی بڑی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ بلکہ معمولی ردّو بدل سے تمام مقاصد حاصل ہو جاتے ہیں۔

(۲) اِس اسکیم کو عملی جامہ پہنانا بہت آسان ہے۔

(۳) اِس سے کسی قوم کے ساتھ ناانصافی نہیں ہوتی۔

(۴) اِس سے فرقہ وارانہ طاقت کے دونوں پلڑے متوازن ہو جائینگے اسوقت ہندو اکثریت کا پلّہ زیادہ بھاری ہے۔

(۵) مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے وہ تمام خطرات دُور ہو جائینگے جو بحالات موجودہ ان کے تمدنی اور اقتصادی مفادات کو لاحق ہیں۔

(۶) ضلع کانگڑہ قسمت انبالہ اور دونہ دگڑھ شنکر کی تحصیلوں کی آبادی زیادہ تر ہندو ہے۔ اور انکے اخراج سے پنجاب میں مسلم آبادی کا فیصدی تناسب ۵۷،۶ سے ۶۶ تک بڑھ جائے گا۔ اور ہندو آبادی کا تناسب ۴۴ سے ۳۴ ہو جائے گا نیز قسمت انبالہ دائمی طور پر قحط زدہ ہونے کی وجہ سے

پنجاب کے لیئے نقصان ہی نقصان کا باعث ہے۔ اور حکومت پنجاب کو اس کی مرفہ الحالی کے لیئے لاکھوں روپے خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ چنانچہ اب بھی اس علاقہ میں قحط سالی کا زور رہا اور رفاہ و بہبود کے موثر ذرائع اختیار کرنے کی تجویزیں پنجاب گورنمنٹ کے زیرِ غور ہیں جن پر ایک کثیر رقم خرچ ہوگی ۱۹۳۹ء کے بجٹ میں قرار پایا ہے۔ کہ اس پر تقریباً دو کروڑ روپے صرف کیئے جائینگے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ایک ہندو آبادی کا بوجھ مسلم ٹیکس گزاران کی گردن پر ڈالا جائے۔

اسلامی حلقوں میں سب سے زیادہ نکتہ چینی اسکیم کے اسی حصہ پر کی گئی ہے۔ اسلیئے اسکے متعلق اور حقائق اور بصائر پیش کرنا غیر ضروری نہ ہوگا۔ وھو ھذا

(۱) جن وجوہ کی بنا پر ہندوستان کے مسلمان اسلامی علاقوں کی علیحدگی کا مطالبہ کر رہے ہیں، وہ زیادہ تر اخلاقی ہیں۔ انھوں نے بین الاقوامی واقعات کے نظائر پیش کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ جب یورپ میں ان سے کہیں زیادہ معمولی اقلیتوں کو خود اختیاری حکومت دی گئی ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اُنکے واجبی حقوق عطا نہیں کیئے جا سکتے۔ اسی استدلال کی بنا پر یہ لازم آتا ہے کہ زیرِ بحث ہندو علاقے اسلامی فیڈریشن میں شامل نہ ہوں اگر ہم ایسا کوئی مطالبہ کریں کہ یہ شامل ہوں تو نہ صرف نا انصافی پر مبنی ہوگا، بلکہ اس سے خود ہمارے اپنے دلائل کی تردید ہوگی۔

(۲) یہ درست ہے کہ اس علاقہ میں معدنیات کی کثرت ہے اور ماہرین نے اس کی آئندہ معدنی پیداوار کے متعلق بہت اُمید افزا رائیں ظاہر کی ہیں لیکن اگر ہم مادی فوائد کی بنا پر اس علاقہ کو سندھ فیڈریشن میں شامل کرنے کا مطالبہ کریں۔ تو ہم بعینہٖ اس نا انصافی کے مرتکب ہوں گے جسکا الزام ہم ہندوؤں پر عاید کرتے ہیں۔

(۳) اگر ہم مذکورہ علاقہ کی ہندو اور مسلم آبادی کی رفتار پر نظر ڈالیں تو اس سے ایک نہایت اہم حقیقت منکشف ہوگی اسلیئے جو بات چالیس پچاس برس میں ایک امرِ واقعہ بنکر نمایاں ہوگی۔ اسکے لیئے موجودہ اور وہ بھی عارضی نقصان کا احساس ہمارے لیئے کاوشِ خاطر کا باعث نہیں ہونا چاہیئے۔

(۶) پنجاب کی موجودہ ہیئت مصنوعی ہے۔ اسے سیاسی مصلحتوں کی بنا پر مختلف اور بے جوڑ حصوں کو ملا کر بنایا گیا ہے۔ جس سے ہندو اور مسلم آبادیوں کے قریب قریب مساوی ہونے کے سبب سے آئے دن فرقہ وارانہ فسادات رونما ہوتے رہتے ہیں، اگر زیر بحث علاقہ کو یوپی سے ملا دیا جائے، یا اس سے ایک نیا صوبہ بنا لیا جائے تو یہ تمام خرابیاں دُور ہو جائیں گی۔

(۷) شمال میں ہندو اقلیت کی تخفیف اور ایک ہندو راجہ کے زیر حکومت ریاست کشمیر کی موجودگی جس کی آبادی زیادہ تر مسلم ہے۔ جنوب مشرقی ہند میں مُسلم اقلیت اور حضور نظام کے زیر حکومت حیدر آباد کی اسلامی ریاست کے تحفظ کی ضمانت ہوگی۔ جس کے باشندے زیادہ تر ہندو ہیں۔

(۸) وہ دیسی ریاستیں جو مرکزی حکومت میں کانگریس کے غلبہ سے خائف ہونے کی بنا پر ۱۹۳۵ء کی آئینی اصلاحات کے مجوزہ فیڈریشن میں شامل ہونے سے محترز ہیں۔ اس اسکیم کے ماتحت ایک متحدہ حکومت میں شامل ہو سکیں گی۔

(۹) علیحدگی کی اس اسکیم کے حق میں بین الاقوامی تاریخ میں متعدد نظائر موجود ہیں۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ جو اصول یُورپ کے سیاسی عقدوں کو حل کرنے میں استعمال کیے جاتے ہیں وہ ہندوستان کی سیاسی پیچیدگیوں کو دُور کرنے کے لیے استعمال نہ کیے جائیں۔ السٹر کی آئرلینڈ سے علیحدگی۔ آسٹریا ہنگری اور شام کی تقسیم۔ فلسطین کی مجوزہ تقسیم۔ اور چکوسلاواکیہ کا جرمنی سے جبریہ الحاق اقلیتوں ہی کے مفاد کی نگہداشت کے لیے عمل میں آیا۔ آسٹریا ہنگری میں جو قومیں آباد تھیں۔ ان میں پھر بھی بعض باتیں مشترک تھیں لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں میں وہ بھی موجود نہیں۔ آسٹریا ہنگری کو صرف اسلیے مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ کہ اس میں بسنے والی قوموں کو اپنا علیحدہ مسکن مل جائے اور وہ اپنے فطری میلانات کے مطابق زندگی بسر کریں یہی حال علاقۂ بالٹک کا ہے جس میں فنلینڈ۔ استونیہ۔ پولینڈ۔ اور لتھونیہ کو خود مختار بنایا گیا۔ اگرچہ جنگِ عظیم سے پہلے ان سب کو معمولی اقلیتیں خیال کیا جاتا تھا۔

(۱۰) یہ اسکیم ہندوؤں، مسلمانوں اور انگریزوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے، یہ ایک مصالحانہ اسکیم ہے، جارحانہ اسکیم نہیں۔ اس سے ہندوستان کے حصے بخرے کر کے اس کی

جغرافیائی وحدت کو تباہ کرنا لازم نہیں آتا بلکہ یہ علیحدگی اتحاد کی آئینہ دار ہے۔ اور بعینہ اس تقسیم سے مشابہت رکھتی ہے۔ جو ہندوستانی گھرانوں میں خانگی جھگڑے صاف کرنے کے لیئے عمل میں آتی ہے۔

(۱۱) اس علیحدگی سے دونوں سرکردہ قوموں کو اپنے طور پر ترقی کرنے کا موقع ملے گا۔ اور انکے باہمی مناقشات دور ہو جائینگے نیز مختلف حصوں کی متحدہ حکومت قائم ہونے سے اقوام ہند کی مجموعی طاقت میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوگا۔ اس سے علیحدگی بھی حاصل ہو جائیگی اور اتحاد کا رشتہ بھی نہ ٹوٹے گا۔

اس اسکیم کے ماتحت جو فیڈریشن قائم ہونگے ان میں سے ہر ایک کی عنانِ حکومت ایک گورنر جنرل اور متعدد صوبائی گورنروں کے ہاتھ میں ہوگی جو مشترکہ معاملات اور کانفیڈریسی کی مشمولہ دیسی ریاستوں کے سرکاری حقوق اور ذمہ داریوں کے انصرام میں مرکزی حکومت کے ماتحت ہوں گے مرکز کی حکومت کا اہتمام ایک وائسرائے اور مجلسِ قانون ساز کے ہاتھ میں ہوگا جس کے ارکین مختلف فیڈریشنوں کے نمائندوں پر مشتمل ہوں گے ہر فیڈریشن کے نمائندوں کی تعداد اسکی جغرافیائی اہمیت۔ آبادی۔ رقبہ۔ اقتصادی حیثیت اور اس قسم کے دیگر اُمور پر موقوف ہوگی۔ اُمور خارجہ۔ دفاع مشترکہ قدرتی ذرائع سے آب رسانی اور فیڈریشنوں کی مشمولہ دیسی ریاستوں کے سرکاری حقوق اور ذمہ داریوں کا بندوبست ہر فیڈریشن کے گورنر جنرل کے سپرد کیا جائے گا۔ جو ان معاملات کی تنظیم و تنفیق کے لیئے وائسرائے کے سامنے جوابدہ ہونگے مرکزی حکومت کے اخراجات کے لیئے مختلف فیڈریشن اپنی آمدنی کا کچھ حصہ براہ راست منتقل کریں گے یا اپنے مالیات کی کسی خاص مد کا کچھ حصہ اس مقصد کے لیئے وقف کر دیں گے۔

یہاں اس امر کی تصریح ضروری معلوم ہوتی ہے۔ کہ شمال مغربی مسلم علاقہ کو کسی صورت میں اپنے محصولات مرکزی حکومت کی نذر نہیں کرنے چاہئیں اسکے معنی یہ ہونگے کہ مرکزی حکومت کو اُسکے محصولات میں تغیر و تبدل کا اختیار ہوگا۔ جو اسکے مفاد کے بالکل منافی ہے۔ اس طرح شمال مغربی علاقہ میں صنعت و حرفت کی ترقی کے امکانات مخدوش ہو جائینگے نیز اس سے اُنکے اقتصادی مفادات کو شدید نقصان پہونچے گا۔

ہندوستان کو دو قوموں تین زبانوں اور پانچ قطعوں میں تقسیم کرنے کی تجویز شاید کچھ

عجیب معلوم ہو۔ لیکن یہ ایک ایسی تجویز نہیں جسے عملی جامہ نہ پہنایا جا سکے۔ ہمیں اس سلسلہ میں یاد رکھنا چاہیئے کہ جیسی کوئی بیماری عجیب ہوگی، ویسا ہی اسکا علاج بھی عجیب ہوگا، چونکہ ہندوستان کی سیاسیات کا مسئلہ انوکھا ہے۔ اسلیئے ضروری ہے کہ اسکا حل بھی انوکھا ہو۔ اس اسکیم کی رُو سے مسلمان اپنے علاقوں میں ہندوؤں کی جارحانہ کارروائیوں کے خوف سے آزاد ہو کر کامل امن و سکون سے زندگی بسر کر سکیں گے۔ اور ہندو اپنے علاقوں پر بلا شرکت غیرے قابض ہو کر نہایت آرام سے بسر اوقات کرینگے۔ صرف وہی فرقہ اس اسکیم کو ناپسند کرے گا جسنے کسی دوسرے فرقہ یا فرقوں کو ناحق تنگ کرنے کا منصوبہ باندھ رکھا ہو۔

برادرانِ ہنود اس تجویز کو پسند کریں یا نہ کریں لیکن وہ مسلم علاقوں کے ہندو علاقوں سے علیحدہ کیے جانے کی مخالفت کرنے میں حق بجانب نہیں۔ متحدہ حکومت صرف متعلقہ جماعتوں کی رضا و منشا سے قائم کی جا سکتی ہے۔ لیکن اگر ان میں سے کوئی جماعت متحدہ حکومت قائم کرنے کے خلاف ہو تو فریقِ مخالف کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسری قوموں کے مقاصد کی مخالفت کرے۔ اُن علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، خالص اسلامی حکومت قائم کرنا مسلمانوں کا پیدائشی حق ہے۔ اور کوئی شخص انھیں اس حق سے محروم نہیں رکھ سکتا۔ اگر انکے اس جائز مطالبہ کی مخالفت کی گئی تو وہ اپنے نصب العین کی تحصیل کے لیے ہر طریقہ استعمال کرنے میں حق بجانب ہونگے۔ ہندوستان زیادہ دیر تک دو متحارب قوموں کا دنگل نہیں رہ سکتا۔ اسکی بہبودی کے لیئے ضروری ہے کہ ان دونوں حریفوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا جائے"۔

آجکل انقلابات جس برق رفتاری سے رونما ہو رہے ہیں اُنکے پیش نظر مسلمانوں کو ابھی سے اپنے مقاصد کی تحصیل میں کوشاں ہونا چاہیئے۔ اور ہندوؤں کی جارحانہ سرگرمیوں سے بچنے کے لیئے برطانیہ ہی کے سایۂ عاطفت میں پناہ نہیں لینی چاہیئے۔ اگر انگریزوں کو ہندوؤں کی بیجا رضاجوئی مقصود نہ ہوتی تو وہ ہرگز ۱۹۳۵ء کی آئینی اصلاحات میں مسلمانوں کی حق تلفی نہ کرتے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ۱۹۳۵ء کا دستورِ اساسی ہندوؤں اور انگریزوں کے مابین ایک سودا ہے جس میں مسلمانوں کو سراسر نقصان ہے۔ کیونکہ اس کی رُو سے ہندوؤں کو مرکزی حکومت میں مسلمانوں پر پورا پورا غلبہ

حاصل ہوجاتا ہے۔ اور انگریزوں کو دیسی ریاستوں کی مدد سے ہندوستان پر دائمی تسلط کا موقع حاصل ہوتا ہے۔

زیر نظر اسکیم کے ساتھ جو دیگر مسائل وابستہ ہیں وہ "پاکستان" کے عمومی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسلیئے ان پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں لیکن "سندھستان"[1] کی اقتصادی حالت کا سوال اسقدر اہم ہے کہ ہم اسپر توجہ دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کہا جاتا ہے، کہ سندھ اور شمال مغربی سرحدی صوبہ کی مالی حالت نہایت پست ہے۔ اور انہیں ہر سال بڑی بھاری امدادی رقمیں دینی پڑتی ہیں، جہاں تک سندھ کا تعلق ہے یہ رقم صرف دس سال کے لیئے عطا کی گئی ہے۔ اور ماہرین مالیات کا اندازہ ہے کہ ۱۹۵۴ء تک سندھ کافی بالذات ہوجائے گا اسلیئے اسکو مرکزی مالیات سے رقم اعانت دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔

شمال مغربی سرحدی صوبہ میں یقیناً اخراجات آمدنی سے کچھ زیادہ رہتے ہیں لیکن پیش نظر اسکیم کی رُو سے ان دونوں صوبوں کو امدادی رقم دینا چنداں مشکل نہیں ہوگا۔ اس صوبے کے اخراجات میں دفاعی اخراجات بھی شامل ہیں لیکن چونکہ دفاع کا مسئلہ تمام ہندوستان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لیئے ان اخراجات میں دوسرے حصے بھی شریک ہونگے نیز ممکن ہے، کہ یہ اخراجات دفاعی تدبیر کا نتیجہ نہ ہونگے بلکہ برطانیہ کی اس حکمت عملی سے وابستہ ہوں کہ قلمرو برطانیہ کے تحفظ کے لیئے قبائلی علاقہ کو فوجوں کی تربیت کے لیئے استعمال کیا جائے، یہ معاملہ صرف اسوقت کھل سکتا ہے جب ہمیں یہ پتہ چل جائے کہ یہ انگریز افسروں اور فوجوں کو سرحد پر تربیت پانے کے بعد ہندوستان میں رکھا جاتا ہے یا کہیں باہر بھیجا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ مسلمانوں اور سکھوں کے دَور میں یہ سوال کبھی نہیں پیدا ہوا اور غالباً اسلامی حکومت کے قیام پر یہ مسئلہ نہیں پیدا ہوگا۔ ممکن ہے کہ یہ دفاعی اخراجات صرف ہند و علاقے کے تحفظ

---

[1] اسکیم زیر نظر کے ماتحت اسلامی علاقہ کا نام "سندھستان" تجویز کیا گیا ہے!

کی خاطر ہوں یا یہ سب شور و غوغا محض ایک ڈھکوسلہ ہو تاکہ ہندوستانیوں کے دل میں ان خطرات کا ڈر پیدا ہو جو ہندوستان کے برطانیہ سے علیحدہ ہونے پر رُونما ہونگے ۔

اس علاقہ میں معدنیات کی کمی نہیں اس میں وہ تمام چیزیں موجود ہیں جن سے صنعت و حرفت کو ترقی دی جا سکتی ہے اگر جاپان اسقدر محدود رقبہ اور معدنی ذرائع کی قلت کے باوجود ایک اوّل درجہ کا صنعتی ملک بن سکتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ "پاکستان" جسکا رقبہ اور ذرائع اس سے کہیں زیادہ ہیں اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو سکے ، یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ دُنیا میں شاید ہی کوئی ایسا ملک ہو جو کسی معدنی پیداوار کے لیے دوسرے ملکوں کا دست نگر نہ ہو، "سندھستان" کا اپنے ہمسایہ اسلامی ممالک سے اسقدر میل جول ہے کہ وہ ان سے مطلوبہ اشیاء حاصل کر سکتا ہے، مثلاً وہ افغانستان کے ساتھ ان معدنیات کی بہم رسانی کے لیے معاہدہ کر سکتا ہے جنکی اسے ضرورت ہو ۔

اگر ہم موجودہ حکومت ہند کے مداخل کو پیش نظر رکھ کر شمال مغربی مسلم علاقہ کے مالیات کا اندازہ لگائیں تو اُن کی کیفیت تخمیناً حسب ذیل ہے ۔

	روپے
کراچی کے بحری محصولات	۱۰۰۰۰۰۰۰
نمک	۲۰۸۷۵۰۰۰
مرکزی اکسائز ڈیوٹی	۷۷۶۵۰۰۰۰
کارپوریشن ٹیکس	۱۵۵۰۰۰۰
انکم ٹیکس	۱۲۴۲۳۴۰۰
افیم	۴۴۹۰۰۰
دیگر مدات	۱۰۶۵۰۰۰
میزان	۱۴۴۱۲۲۴۰۰
این ڈبلیو آر (خالص منافع)	۵۹۹۵۸۰۰۰
پوسٹ اور ٹیلی گراف)	۷۴۶۰۰۰

	روپے
رسومات قرض	۶۶۳۰۰۰
سول ایڈمنسٹریشن	۹۵۹۰۰۰
کرنسی اور ٹکسال	۶۶۹۰۰۰
سول ورکس اور متفرق پبلک فادات	۳۰۹۰۰۰
متفرقات	۱۵۴۸۶۰۰۰
دفاعی اخراجات	۵۵۹۶۰۰۰
غیر معمولی مدات	۳۷۵۱۴۰۰
میزان	۷۴۲۴۰۰۰
میزانکل	۲۱۸۳۶۲۴۰۰

اب ہندوستان کے ان تخمینی مالیات میں چند لاکھ روپے کی رقم اور اضافہ کیجئے جو شمال مغربی علاقہ کی مشمولہ دیسی ریاستیں مرکزی مالیت میں منتقل کریں گی۔ ان ذرائع سے شمال مغربی مسلم فیڈریشن کے سالانہ محاصل کا کل میزان اندازاً ۲۲ کروڑ روپے ہوگا۔

شمال مغربی مسلم فیڈریشن کے اخراجات کا اندازہ لگانے کے لیے برما کے میزانیہ میں ہندوستان سے علیحدہ ہونے پر جو مزید مدات خرچ اضافہ ہوئیں نظیر کے طور پر پیش نظر رکھیئے۔ یہ مدات حسب ذیل ہیں۔

	روپے
محکمہ بحری لگائی	۱۰۷۴۰۰۰
ایکسائز ڈیوٹی	۹۵۰۰۰
محکمہ انکم ٹیکس	۱۵۵۲۰۰۰
محکمہ نمک	۱۹۳۰۰۰
ریلوے کے متفرق اخراجات	۱۰۴۰۰۰
محکمہ پوسٹ اور ٹیلیگراف	۵۵۴۰۰۰
سود اور ادائیگی قرضہ	۱۸۰۴۴۰۰۰

	روپے
پڑتال	۱۳۸۲۰۰۰
مذہبی ادارے	۲۱۰۰۰۰
اُمورِ خارجہ	۲۳۳۰۰۰۰
سائنس کے ادارے	۷۸۱۷۰۰
پرواز	۶۴۰۰۰۰
ڈیفنس	۱۳۳۳۰۰۰۰۰
فرنیٹر فورسس	۵۳۹۶۰۰۰
میزان	۴۳۰۵۹۷۰۰

شمال مغربی خطہ ہائے "ستدستان" کی آبادی ۳۵۲۶۸۶۰۳ اور برما کی آبادی ۱۴۶۶۷۱۴۶ ہے، یعنی اِن خطوں کی آبادی برما سے اڑھائی گنا زیادہ ہے۔ ہندوستان کے مالیات کا جو تخمینہ اوپر پیش کیا گیا ہے اسکا موازنہ برما کے مداخل سے کیا جائے تو وہ اُس سے چار گنا زیادہ ہے۔

آبادی اور مالیات کے مشروح الصدر اعداد و شمار کو پیشِ نظر رکھا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ نیا فیڈریشن برما سے تین گنا بڑا ہوگا۔ اِسلیئے اسکا خرچ زیادہ سے زیادہ برما سے چار گنا یعنی تقریباً ۲۲۳۸۰۰۰۷ روپے ہوگا، اگر ہم اس رقم میں ۲۰۵۰۰۰۰۰ روپے کی رقم بڑھا دیں جو اسوقت سندھ اور شمال مغربی سرحدی صوبہ کو سرکاری امداد کے طور پر دی جاتی ہے تو اس فیڈریشن کے اخراجات ان مدات کے مماثلت کی بنا پر جو برما کے ہندوستان سے علیحدہ ہونے پر اسکے میزانیہ میں شامل ہوئے ۶۱۹۲۷۳۸۰۰۰ روپے ہونگے۔ یعنی ۲۲۰۰۰۰۰۰ روپے کی کل آمدنی سے مبلغ ۲۷۳۶۱۲۰۰ روپے کم۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اس مال پر جو ہندوعلاقہ سے سندھ فیڈریشن کے علاقوں میں آئے گا محصول چنگی عاید کر کے کراچی کے محصولات میں ۵ کروڑ روپے کا مزید اضافہ کیا جا سکتا ہے، حکومت ہند کی محصول بحری کی آمدنی بعض اوقات ۴ ۵ کروڑ سالانہ سے بھی متجاوز ہو جاتی ہے چونکہ شمال مغربی مسلم علاقہ جات میں ہندوستان کے تمام علاقوں سے زیادہ بدیشی مال کی کھپت ہے اسلیئے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ کراچی کے محصولات کی یہ آمدنی مذکورہ رقم سے ایک چوتھائی کی صورت میں ظاہر ہوگی!

حقائق وعبر

لالہ اور مُلّا

ہمارے قومیت پرست "علمار کرام" عوام کو ہمیشہ یہ کہہ کر دھوکا دیتے ہیں کہ ہماری نگاہیں کتاب وسنت کے حقائق ومعارف پر ہیں۔ ہم نے اپنا موجودہ مسلک اسی سراجِ منیر کی روشنی میں اختیار کر رکھا ہے۔ اسلیے دین کی صراطِ مستقیم وہی ہے جسپر ہم گامزن ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ وہ دعوے ہے جسکے اثبات میں یہ حضرات کوئی سند نہیں پیش کر سکتے! اور ہر وہ شخص جسنے اس باب میں کبھی ایک مرتبہ بھی کتاب وسنت کے مطالعہ کی کوشش کی ہو۔ وہ خوب سمجھتا ہے کہ متحدہ قومیت کا نظر فریب مسلک اسلامی تعلیم کے کس قدر منافی ہے۔ مسلمان تو ایک طرف اگر کسی غیر مسلم نے بھی اس باب میں کچھ تجسس کی ہے تو وہ بھی اس نتیجہ پر پہونچا ہے کہ متحدہ قومیت کی تشکیل کی اسلام میں کہیں گنجایش نہیں۔ حال ہی میں اخبار ترجمان (مورخہ ۱۲ جولائی) میں لالہ لاجپت رائے کا ایک خط شائع ہوا ہے جو انھوں نے مسٹر سی آر۔ داس کو لکھا تھا۔ ملاحظہ فرمایئے کہ وہ کتاب وسنت کے مطالعہ سے (جو انھوں نے لامحالہ تراجم کے ذریعہ سے کیا ہوگا) کس نتیجہ پر پہونچے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

> ایک اور چیز جو کچھ عرصہ سے میرے لیئے بیحد وجہ اضطراب ہو رہی ہے وہ ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ ہو اور میں چاہتا ہوں کہ آپ کو اسپر دعوتِ غور وخوض دوں۔ گذشتہ ۶ ماہ میں میں نے اپنے وقت کا بیشتر حصہ اسلامی تاریخ اور اسلامی قوانین کے مطالعہ میں صرف کیا ہے اور اس سے جس نتیجہ پر میں پہونچا ہوں وہ یہ ہے۔ کہ یہ چیز (یعنی ہندو مسلم اتحاد) ایک امر محال اور ناقابل عمل شئے ہے۔ وہ مسلمان راہنما جو عدم تعاون کی تحریک میں شامل ہیں اگر انکے خلوص نیت کو تسلیم بھی کر لیا جائے پھر بھی میرے خیال میں انکا مذہب اس چیز (ہندو مسلم اتحاد) کے راستے میں ایک زبردست رکاوٹ ثابت ہوگا'

آپ کو یاد ہوگا، کہ میں نے کلکتہ میں اپنی اس گفتگو کا جو اس باب میں حکیم اجمل خاں صاحب اور ڈاکٹر کچلو سے ہوئی تھی۔ آپ سے تذکرہ کیا تھا۔ ہندوستان میں حکیم صاحب سے زیادہ سلجھا ہوا کوئی مسلمان نہیں لیکن سوال یہ ہے۔ کہ کیا حکیم صاحب یا کوئی دوسرا مسلمان راہ نما قرآن کی تعلیم کے احکامات پر خطِ تنسیخ کھینچ سکتا ہے اخذ اکرے کہ اسلامی قوانین کے مطالعہ کے بعد جس نتیجہ پر میں پہونچا ہوں وہ غلط ہو کیونکہ میرے دل کی کھٹک کو دُور کرنے کے لیے اس سے زیادہ عمدہ بات کوئی نہ ہو گی۔ لیکن اگر میرا خیال صحیح ہے تو اسکا مطلب یہ ہوگا کہ ہم (ہندو اور مسلمان) انگریز کے مقابلہ کے لیے تو متحد ہو سکتے ہیں۔ لیکن برطانوی طرزِ حکومت کے مطابق ہندوستان میں نظام حکومت قائم کرنے کے لیے ایسا اتحاد ناممکن نظر آتا ہے۔ اسکا دوسرے لفظوں میں یہ مطلب ہوگا کہ ہم ہندوستان میں جمہوری طرزِ حکومت قائم نہیں کر سکتے تو پھر اسکا علاج کیا ہے ؟ میں ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں سے خائف نہیں ہوں لیکن ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں اور اُنکے ساتھ افغانستان وسطِ ایشیا عرب عراق اور ترکی کے مسلح لشکروں کی تاب ہم نہ لا سکیں گے میں تہِ دل سے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت کا قائل ہوں۔ اسکے لیے میں مسلمان راہ نماؤں پر اعتماد کرنے کو بھی تیار ہوں لیکن قرآن و حدیث کے احکام کو ہم کیا کرینگے؟ مسلمان راہ نما ان پر تو خطِ تنسیخ نہیں کھینچ سکتے۔ تو پھر کیا ہماری یہ تباہی قضا مبرم ہے ؟ اُمید ہے کہ ایسا نہ ہوگا۔ اور آپ کا ذہنِ رسا اور قلبِ بصیر اس مشکل کا کوئی حل تجویز کر سکے گا۔"

حیرت ہے کہ جو بات لالہ جی کو اسلامی تعلیم سے متعلق چند ماہ کے مطالعہ سے نظر آگئی وہ ہمارے اجارہ دارانِ علومِ دین کی سمجھ میں ساری عمر کے مزعومہ تدبر و تفحص کے باوجود بھی نہ آسکی۔ فرق یہ ہے کہ لالہ جی نے ان چیزوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، اور مُلّا جی انہیں گاندھی جی کی عینک سے دیکھتے ہیں۔ پھر دونوں ایک نتیجہ پر کیسے پہونچ سکیں !

شیخِ ملّت با حدیثِ دلنشیں ! بر مرادِ او کند تفسیرِ دیں ! (اقبال ؒ)

ہندو کی تعریف | ہندوؤں کے بڑے بڑے سمجھدار سیاسی اور مذہبی راہنما صدیوں سے اس کوشش میں تھے کہ وہ یہ بتا سکیں کہ ہندو کسے کہتے ہیں لیکن ان کی تمام کوششیں خاسر و نامراد رہیں۔ وہ اب تک طے نہ کر سکے کہ ہندو کی تعریف (Definition) کیا ہے، بارے یہ سعادت مسٹر ساورکر صدر ہندو مہاسبھا کے حصہ میں آئی۔ اور انھوں نے معلوم کر لیا کہ ہندو کسے کہا جا سکتا ہے، وہ اپنی اس تحقیقِ انیق کو ان الفاظ میں پیش فرماتے ہیں:۔

"ہر وہ شخص جو اس بھارت بھومی کو یعنی اُس سرزمین کو جو دریائے سندھ سے سمندروں تک پھیلی ہوئی ہے اپنی مادر وطن اور مقدس سرزمین کو اپنے مذہب کا سرچشمہ اور اپنے ایمان کا گہوارہ سمجھتا ہے۔ وہ ہندو ہے۔ اسلئے ویدک دھرم۔ سناتن دھرم۔ جین اور بدھ مت کے ماننے والے لنگ کی پرستش کرنے والے سکھ۔ آریہ سماجی۔ برہمو سماجی، دیوسماجی۔ پرارتھنا سماجی اور اس قسم کے دوسرے سودیشی مذاہب کے پیرو سب ہندو ہیں۔ اور یہ مذاہب ہندو مت ہی کے اجزاء ہیں۔ یعنی ہندو قوم کے عناصر۔ لہٰذا پہاڑی علاقوں کے باشندے یا ہندوستان کے مرحومہ اصلی باشندے سب ہندو ہیں اسلئے کہ وہ ہندوستان کو مادر وطن اور مقدس زمین سمجھتے ہیں۔ خواہ وہ مذہب یا پوجا پاٹ کی کسی شکل کا اتباع کرتے ہوں۔ گورنمنٹ کو چاہئے کہ ہندو کی اس تعریف کو تسلیم کرے۔ اور آئندہ مردم شماری میں اسی معیار کے مطابق ہندوؤں کا شمار کرے۔" (اسٹیٹس مین ۱۲/۲۹ ۳۰ء)

اس تعریف کے مطابق ظاہر ہے کہ تمام قومیت پرست حضرات جو ہندوستان کو مادرِ وطن سمجھتے ہیں خود بخود ہندوؤں کے صف میں شمار ہو جائینگے۔ مسٹر ساورکر شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس شترمرغ قسم کی نوع (Species) کے لیے کوئی خاص خانہ تو متعین کرا دیا۔ ورنہ مردم شماری کے اربابِ حل و عقد کو بڑی دقت پیش آتی۔ البتہ کانگریس کو اس باب میں ذرا دقت محسوس ہوگی اسلئے کہ انکا مقصد تو اُسی وقت تک پورا ہوتا ہے جب تک نیشنلسٹ حضرات اپنے آپ کو مسلمان کہلاتے ہیں۔ اگر انکا شمار بھی ہندوؤں کے ساتھ ہو گیا تو متحدہ قومیت کیسے بنے گی۔

فریب آزادی | تحریکِ کانگریس کے متعلق ہمیشہ یہ فریب دیا جاتا ہے کہ اسکا نصب العین مکمل آزادی کا حصول ہے۔ لیکن ہم شروع سے یہ کہتے چلے آرہے ہیں۔ کہ یہ محض فریب ہے۔ ہندو کبھی گوارا نہیں کرسکتا کہ انگریز ہندوستان سے چلا جائے وہ ان کی سنگینوں کی آڑ میں مسلمان پر حکومت کرنا چاہتا ہے۔ اور سنیئے کہ مسٹر راجہ گوپال آچاریہ اس باب میں کیا فرماتے ہیں:۔

"کانگریس کا نصب العین درجۂ نوآبادیات (Dominion Status) سے کچھ مختلف ہے لیکن اسکا یہ مطلب نہیں کہ اگر مصالح وقت کا تقاضا ہو تو مکمل آزادی کی بجائے درجۂ نوآبادیات قابلِ قبول نہ ہوگا۔ اس چیز کا فیصلہ سیاسی مدبرین پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ آج تو درجۂ نوآبادیات بھی مکمل آزادی کے مرادف قرار دیا جاسکتا ہے، بلکہ یہ چیز مکمل آزادی سے بھی تعبیر ہوسکتی ہے کیونکہ اس میں بحری قوت (Naval Power) بغیر پیسہ صرف کیئے مفت میں ہاتھ آجائیگی"۔ (فارورڈ بلاک۔ ۲)

یہ ہیں مکمل آزادی کے مدعیوں کے دلی ارادے!!

سنگ راہ | واقعات بتا رہے ہیں کہ خود کانگریس بھی اب اس امر کا اعتراف کر رہی ہے کہ مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تسلیم کیئے بغیر چارہ نہیں لیکن اس حقیقت کے اعتراف میں اُنکے سامنے سب سے بڑی مشکل قومیت پرست مسلمانوں کا سوال ہے اگر کانگریس نے لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت مان لیا تو یہ بیچارے کہاں جائینگے چنانچہ سردار پٹیل اپنی ایک تقریر میں فرماتے ہیں:۔

"اگر کانگریس۔ لیگ کے دعویٰ نمائندگی کو تسلیم کرے تو اسکے یہ معنے ہونگے کہ اسے سرحد کے (قومیت پرست) پٹھانوں کو چھوڑنا ہوگا اُن شیعوں کو تیاگ دینا پڑیگا۔ جو ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں میں سے تین کروڑ کی جماعت ہیں۔ اور یہی نہیں بلکہ یہ تو مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے مسلمان قومیت پرست حضرات سے غداری کے مرادف ہوگا جنہوں نے موجودہ نیشنل کانگریس کی تشکیل میں اسقدر حصہ لیا ہے ..... کیا ہم مولانا آزاد اور جمعیتہ العلما

کے لیڈروں سے آج یہ کہہ دیں۔ کہ آپ اس قومی ادارہ سے تشریف لے جائیے اور مسٹر جناح کی قیادت تسلیم کیجیے"۔ (ہندوستان ٹائمز ۲۷/۹/۱۲)

ہم تو سمجھتے تھے کہ ہندو بڑا احسان ناشناس ہے۔ لیکن معلوم ہوا کہ ایسا نہیں حق الخدمت کی ادائیگی کا اس میں بڑا احساس ہے۔ اور بات ہے بھی ٹھیک یہ بیچارے قومیت پرست اب جائیں بھی کدھر! کیسی بے بسی کا عالم ہے! ہندو انگریز کی خوشامد کر رہا ہے کہ دیکھیے حضور! ہم نے آڑے وقتوں میں آپ کی مدد کی تھی اب اگر آپ ہمیں چھوڑ کر چلے گئے تو پھر سرحد کے ہینگ بیچنے والے ہمیں کھا جائیں گے! اور یہ قومیت پرست حضرات ہندوؤں کی منتیں کر رہے ہیں کہ مہاراج! دیکھیے ہم نے اپنوں کو چھوڑ کر آپ کو اپنا "مائی باپ" بنایا تھا۔ اگر آپ نے بھی ہمیں تیاگ دیا تو ہمارا دنیا میں کون ساٹھکانا ہے ہمیں یا تو اپنے ہی چرنوں میں رہنے دیجیے۔

یا بتا دو اور کوئی اپنے جیسا گھر ہمیں

اے کاش! یہ لوگ اس حقیقت کو سمجھ سکتے کہ : وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ (۶۳/۸)

کہ عزت تمام اللہ اور اسکے رسول اور مومنین کے ساتھ رہنے میں ہے۔ دوسروں سے جا ملنے میں نہیں۔

سجود و نیاز | ملت مغرب کی ایفونی ادویات میں ایک اہم جزو "خطابات" کا بھی ہے۔ اس "اعزاز" کے حصول کی خاطر کس قسم کی "خدماتِ جلیلہ" کو سرانجام دینا ہوتا ہے اسے تو چھوڑیے۔ دیکھیے کہ ان تمام مراحل کو طے کر لینے پر یہ تمغۂ امتیاز وصول کیسے کیا جاتا ہے۔ حال ہی کا ذکر ہے۔ جن بزرگوں نے جناب گورنر صاحب بہادر صوبۂ یو۔ پی کے دستِ مبارک سے ان اعزازات کو حاصل کرنے کے لیے پیش ہونا تھا، انھیں اس تقریبِ سعید پر مختلف رسومات ادا کرنی تھیں منجملہ انکے ایک یہ بھی حکم تھا کہ :-

جب تمہارا نام پکارا جائے تو براہِ کرم قالین کے کنارے پر تشریف لے آئیے اور سب سے پہلے ہز ایکسیلنسی کے سامنے سر جھکائیے پھر قالین کے وسط تک پہنچ جائیے۔ اور ایک بار پھر سر جھکائیے پھر اس "عرشِ اعلیٰ" (Dias) کے قریب جائیے جہاں حضور گورنر استادہ ہونگے وہاں پھر سر جھکائیے اسکے بعد جناب گورنر صاحب آپ کو تمغۂ امتیازی عطا فرما کر آپ سے مصافحہ

کرینگے آپ ایک بار پھر جھکئے پھر چار قدم پچھلے پاؤں چلیے۔ اور پھر جھکئے اور پھر اپنی جگہ پر واپس تشریف لے آیئے"۔ (دہری جن مورخہ ۱۲؍ جون ۲۷ء)

ہندو بھائیوں کو تو چھوڑ دیجئے کہ وہ چونکہ پتھروں اور درختوں اور حیوانوں کے سامنے جھکنے کے عادی ہیں اسلئے شاید انھیں اس قسم کا "جھک جھکاؤ" کچھ برا معلوم نہ ہو لیکن ہم پوچھتے ہیں، ان مسلمانوں سے جو دن میں پچاس مرتبہ اسکا اعتراف کرتے ہیں۔ کہ (ایاک نعبد و ایاک نستعین) کہ انکی غیرت ان سجود و نیاز کو کیسے گوارا کرلیتی ہے! اے کاش! ان راہ گم کردہ پیروان دین حنیف کی سمجھ میں یہ بات آجائے کہ جو اللہ کے سامنے جھکتا ہے وہ پھر کسی اور کے سامنے نہیں جھک سکتا۔ خدا کرے کہ ان رسمی سجدہ کرنیوالوں کو کہیں ایک حقیقی سجدہ بھی میسر آجائے اور وہ سمجھ سکیں کہ ؎

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدہ سے دیتا ہے آدمی کو نجات!

نماز روزہ قبول سچ ہے۔ اگر اخلاص کے ساتھ استقلال بھی ہو تو حسنِ خدمات کا صلہ ملکر رہتا ہے ؎

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایمان ہے

بارے الحمد۔ کہ آستانۂ وار دھا کی مسلسل جبیں سائی بالآخر رنگ لائی۔ تذلل و تعبد کے سجدہ ہائے دراز کو شرفِ مقبولیت عطا ہوا۔ عمر بھر کی محنت ٹھکانے لگی۔ اور حضرت مولانا ابوالکلام آزاد سامری سحرِ فن کے اشارہ پر آئندہ اجلاس کانگریس کے صدر منتخب ہوگئے۔ ملتِ اسلامیہ انکے اس منصبِ جلیلہ پر ہدیۂ تبریک و تحسین پیش کرتی ہوئی دست بدعا ہے کہ:۔

تیرے بلند مناصب کی خیر ہو یا رب!
کہ جنکے واسطے تو نے کیا خودی کو ہلاک

یہ سربلندی و سرفرازی کن مقاصد کے پیشِ نظر عطا ہوئی ہے، ہم سے نہیں ایک ہندو لیڈر کی زبان سے سنیے اور پھر یہ بھی ملاحظہ فرمایئے کہ خود ہندو اس حربہ کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں:۔

مولانا صاحب کی عہدۂ صدارت کے لیئے اُمیدواری کی اس بناء پر حمایت کی جارہی ہے کہ

اس سے ہندو مسلم اتحاد میں آسانیاں پیدا ہو جائیں گی لیکن یہ خیال فرقہ وارانہ مسئلہ کے متعلق افسوسناک ناواقفیت کی غمازی کرتا ہے۔ اب یہ ممکن نہیں کہ آپ کسی ایک فرد کی عزت بڑھانے سے ملتِ اسلامیہ کو خوش کر لینگے بلکہ یہ خیال کہ مسلمان اس بات سے راضی ہو جائینگے کہ کانگریس نے ایک مسلمان کو صدر منتخب کیا ہے۔ اور اس بناء پر وہ کانگریس سے مصالحت پر آمادہ ہو جائینگے مسلمانوں کی ذہانت کی توہین ہے یہ مسئلہ افراد کی عزت افزائی سے حاصل نہیں ہو سکتا۔" (مسٹر ایم این رائے۔ انڈی پینڈنٹ انڈیا ۱۱/۲/۴۰)

کانگریس نے جس غرض کے لیے مولانا صاحب کو صدر بنایا ہے وہ ظاہر ہے مسلم لیگ کا دعویٰ ہو کہ کانگریس ہندوؤں کی جماعت ہے اسلئے کوئی ایسا نظام و آئین جو اُنکا مرتب کردہ ہو مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتا اس بناء پر مسلم لیگ نے کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کی مخالفت کی ہے ہندو یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ نہیں! کانگریس ہندو مسلمانوں کی مشترکہ جماعت ہے دیکھو! اگر یہ ہندوؤں کی جماعت ہوتی تو اُسکا صدر ایک مسلمان کیسے ہو جاتا! اور مولانا آزاد ہیں۔ کہ اس مقصد کے حصول کے لیے اپنے آپ کو بڑھ چڑھ کر پیش کر دیتے ہیں۔ اور کریں بھی کیوں نہ اگر وہ ایسے آڑے وقت میں ہندوؤں کے کام نہ آئے تو پھر اور کس دن کام آئیں گے!

یہ تو ہیں ہندوؤں کی چالیں اور اُنکے منصوبے اور اُنکے مقابلہ میں مسلمانوں کے اربابِ بست و کشاد کی یہ حالت ہے کہ مولانا صاحب کی خدمت میں ہدیہ تبریک پیش کرنے کے لیے لاہور کے ٹاؤن ہال میں جلسہ ہوتا ہے۔ اور حضور وزیر اعظم جناب سر سکندر حیات خاں۔ و دیگر وزراء حضرات باعثِ رونق افروزیٔ اجلاس ہوتے ہیں۔ اسمبلی کے سپیکر جناب سر شہاب الدین صاحب۔ مولانا صاحب کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالتے ہیں جلسہ تبریک و تحسین کے نعروں سے گونج اُٹھتا ہے۔ دوسرے دن جناب وزیر اعظم صاحب مولانا صاحب کو دوپہر کے کھانے پر مدعو فرماتے ہیں اور دونوں دو گھنٹہ تک تخلیہ میں راز و نیاز کی باتیں کرتے ہیں۔

یہ ہیں آپ کے وہ وزیر اعظم جو لیگ کے سب سے بڑے حامی ہونے کے مدعی ہیں جن کی یہ حالت ہو

کہ جب مسٹر جناح شملہ تشریف لے جاتے ہیں اور انکا نہایت پُر شکوہ جلوس نکالا جاتا ہے تو یہ شملہ چھوڑ کر باہر چلے جاتے ہیں اور جب مولوی فضل الحق صاحب ایک عظیم الشان جلسہ میں شمولیت کے لیئے وہاں پہونچتے ہیں تو یہ شملہ میں ہوتے ہوئے نہ اُنکے استقبال کے لیئے جاتے ہیں نہ جلسہ میں شریک ہوتے ہیں۔ اور دوسری طرف مولانا آزاد وہ ہیں کہ جب گاندھی جی نے یہ چاہا تھا کہ مسٹر جناح کے ساتھ گفتگوئے مصالحت میں مولانا آزاد کو بھی شریک کر لیا جائے تو مسٹر جناح نے صاف انکار کر دیا تھا۔ اور گاندھی جی کو تار دیا تھا کہ آنا ہو تو تنہا آئیے انھیں ساتھ نہ لائیے۔ اور یہ اُسوقت تھا جب ابھی مولانا صاحب اتنی خطرناک سازش کا الیاڈا ضیع آلہ کار نہیں بنائے گئے تھے۔ لیکن آج جب کہ وہ مسلمانوں کے خلاف اتنی گہری سازش کے ماتحت کرسی صدارت پر سرفراز کیئے جاتے ہیں تو ہمارے وزیر اعظم ان سے اسقدر گہرے دوستانہ مراسم کی پینگیں بڑھاتے ہیں ہمیں ذرا بھی اس میں تعجب نہ ہوگا اگر کل کو پنجاب میں کانگریس پارٹی زیادہ زور پکڑ جائے تو یہی حضرات کھلم کھلا کانگریسی ہو جائیں۔ سر سکندر حیات خاں صاحب نے ابھی اگلے دنوں ایک تقریر کے دوران میں فرمایا ہے کہ:۔

"فرقہ وارانہ مسئلہ کوئی مذہبی سوال نہیں ہے یہ صرف دُنیاوی اور مادی معاملات ہیں جہاں تک میں نے اس مسئلہ کا تجزیہ کیا ہے میں تو اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ محض روٹیوں کی تقسیم کا سوال اور سیاسی توازن کا معاملہ ہے یعنی یہ کہ مجالس قوانین ساز اور لوکل باڈیز میں ہماری نمائندگی کتنی ہو اور انتظامی شعبوں میں ہمارا حصہ کس قدر ہو......"

اسی تقریر میں آپ دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ:۔

"اقلیتوں کو یہ بدگمانی ہے کہ اکثریت کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کے انعقاد پر اسلیئے زور دے رہی ہے کہ وہ اپنی تعداد کے بل بوتے پر اقلیتوں کے جائز حقوق کو دبا لیں گے میں اس بدگمانی کی تائید نہیں کرتا۔" (ہندوستان ٹائمز مورخہ $\frac{1}{4}$ ۱۸)

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ہوا کا رُخ کدھر کو ہے! ہمیں ان کی ان حرکات پر افسوس ضرور ہوتا ہے لیکن ہم اس سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتے اس لیئے کہ

میں جانتا ہوں مآلِ سکندری کیا ہے ! (اقبالؒ)

اعترافِ حقیقت مسٹر جناح نے اگلے دنوں مجلہ "ٹائم اینڈ ٹائیڈ" میں ایک بسیط مضمون شائع فرمایا ہے جس میں لیگ اور کانگریس کی پوزیشن پر سیر حاصل بحث کی ہے اور مسکت دلائل و براہین قاطعہ سے ثابت کیا ہے کہ ہندوستان میں مسلمان ایک جداگانہ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ فرقہ نہیں ہیں۔ اس مضمون کے ضمن میں بھائی پرمانند صاحب نے اخبارات میں ایک بیان شائع کیا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں:۔

خالصۃً مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو مسٹر جناح نے جو کچھ کہا ہے وہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے سنٹرل اسمبلی کے مسلمان ممبر ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے نمائندہ ہوتے ہیں۔ انکے رویہ کو اگر دیکھا جائے تو اس بات کے لیے کسی اور ثبوت کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ مسٹر جناح واقعی ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے افکار و آراء کی نمائندگی کرتے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا مہاتما گاندھی نے کہا تھا کہ جو کچھ مسٹر جناح کہتے ہیں اگر وہی مسلمانوں کے افکار و آراء کا صحیح نمونہ ہے تو کانگریس نے جو کام پچاس سال سے زیادہ عرصہ میں کیا، وہ تمام اکارت گیا۔ لیکن خود کانگریس شروع ہی سے مسلم لیگ کے ساتھ تمام معاملات اسی بنا پر طے کرتی رہی ہے کہ مسلم لیگ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں مہاتما گاندھی نے تحریکِ خلافت کے رہنماؤں کے ساتھ ملاپ پیدا کیا لیکن وہ تحریک ختم ہو چکی ہے۔ اسلیے اب پھر مسلم لیگ اسی طرح بہ حیثیت نمائندہ جملہ مسلمانانِ ہند شہرت پکڑ گئی ہے جس طرح کہ خود کانگریس تمام ہندوستانیوں کی نمائندگی کا دعویٰ کرتی ہے۔ مسلم لیگ کی پالیسی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میں مہاتما گاندھی اور انکے رفقائے کار کو صرف ایک چیز کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ وہ یا تو کانگریس کی تحریک کو تحریکِ خلافت کی طرح ختم کر دیں اور ہندو مہاسبھا میں شامل ہو جائیں یا اس حقیقت کا کھلم کھلا اقرار کر لیں کہ کانگریس واقعی ہندوؤں کی ایک جماعت ہے۔ اسکے سوا کوئی دوسری راہ نہیں ہے۔"

(ہندوستان ٹائمز مورخہ ۱۵ ؍ ۱ ؍ ۴۰)

انگریز تسلیم کرتا ہے کہ لیگ فی الواقعہ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے، مہابھائی ہندو کھلے کھلے الفاظ میں اِس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے، کانگریس خود عملاً اسکی معترف ہے۔ غرضیکہ ہر ایک اب اِس حقیقتِ نفس الامری کے اعتراف پر مجبور ہو رہا ہے لیکن اگر اس سے کوئی اب تک انکاری ہے تو ہمارا قوم پرست مسلمانوں کا طبقہ۔ ضد کی بھی کوئی انتہا ہونی چاہیے۔

کون سچا ہے؟ اخبار مدینہ نے اپنی ۸ فروری ۱۹۴۰ء کی اشاعت کے مقالہ افتتاحیہ میں لکھا تھا:۔

مولانا ابوالکلام آزاد سے بڑھ کر کانگریس کا حامی و ناصر کون ہوگا لیکن آپ بھی ہندوستان میں مسلمانوں کو ایک جُداگانہ قوم سمجھتے ہیں۔..... چنانچہ مولانائے محترم نے اس موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے راقم الحروف سے فرمایا تھا کہ "مسلمانوں کو ہر در و دیوار پر نقش کر دینا چاہیے" کہ وہ اپنی ملّی انفرادیت کو کسی قیمت پر بھی نہیں چھوڑ سکتے۔..... پچھلے دنوں مولانا نے اس موضوع پر مدینہ میں ایک سلسلۂ مضامین لکھنے کا وعدہ فرمایا تھا لیکن افسوس ہے کہ موصوف کی مصروفیت و علالت کی وجہ سے یہ وعدہ پورا نہ ہو سکا ورنہ ہم اسکے اقتباسات پیش کر کے گاندھی جی کو بتلاتے کہ اس مسئلہ میں انھوں نے اپنے نفس کو کتنا فریب دے رکھا ہے"

مولانا آزاد کے خیالات کے متعلق یہ مدیر مدینہ کا اعلان ہے لیکن مولانا صاحب کا اس باب میں اپنا اعلان کیا ہے، وہ بھی ملاحظہ فرمایئے۔ انتخابِ صدارت کے فوری بعد لاہور میں ایک تقریر کے دوران میں مولانا صاحب نے فرمایا:۔

مسٹر جناح کا یہ نظریہ کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دو جُداگانہ اقوام ہیں، غلط فہمی پر مبنی ہے میں اس باب میں اُن سے متفق نہیں ہوں (اسٹیٹسمین۔ مورخہ ۱۹ مارچ)

دیکھیں اب جناب مدیر مدینہ اس باب میں کیا ارشاد فرماتے ہیں

اور آپ نے یہ بھی دیکھا کہ مسلمانوں کی جداگانہ قومیت سے انکار کرنے والے کون مولانا آزاد ہیں! وہی جنھوں نے دورِ قومیت پرستی سے پہلے اپنی عمر اس حقیقت کے اعلان میں صرف کر دی تھی کہ مسلمان ایک جداگانہ ملت ہیں اور دنیا کی کسی قوم میں ضم ہو کر متحدہ قومیت نہیں بنا سکتے۔

انقلابات ہیں زمانہ کے!

واحسرتا! کہ آج وہ مردِ حق بیں موجود نہ ہوا جنہے مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے غیر اسلامی نظریۂ قومیت کو سُن کر فرمایا تھا کہ:۔

چہ بے خبر ز مقامِ محمد عربی است!

وہ آج زندہ ہوتے تو مولانا آزاد کو بتاتے کہ مسلمان کس طرح ایک الگ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس حقیقت کا ابطال کتنی کھلی ہوئی بوالہبی ہے۔

جب اور اب | جب

"ہم تو خود مسلمانوں کی سب سے بڑی غلطی سمجھتے ہیں کہ ہمیشہ انھوں نے اپنے سامنے دو ہی راستے دیکھے۔ یا گورنمنٹ پر اعتماد اور یا ہندوؤں اور کانگریس کی شرکت"۔ (مولانا آزاد الہلال ۲۹ ۱۲/۱۳)

اب

"مسلمانوں کو اپنے حقوق کے تحفظات کے لیے گورنمنٹ برطانیہ کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے، انھیں اپنے برادرانِ وطن کی طرف دیکھنا چاہیے...... ان سے بدگمان نہیں رہنا چاہیے۔ بلکہ جوق در جوق کانگریس میں شریک ہو جانا چاہیے۔ کانگریس کے ہاتھوں میں ان کے حقوق بالکل محفوظ ہیں"۔ (اسٹیٹسمین مورخہ ۱۹ ۱/۴۶)

جب

"اور ہمارا عقیدہ ہے کہ جو مسلمان اپنے کسی عمل و اعتقاد کے لیے بھی اس کتاب کے سوا کسی دوسری جماعت یا تعلیم کو اپنا راہ نما بنائے وہ مسلم نہیں، بلکہ شرک فی صفات اللہ کی طرح

شرک فی صفات القرآن کا مجرم اور اس لیے مشرک ہے اسلام اس سے بہت ارفع واعلیٰ ہے کہ اسکے پیرووں کو اپنے پولیٹیکل پالیسی قائم کرنے کے لیے ہندوؤں کی پیروی کرنی پڑے مسلمانوں کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی شرم انگیز سوال نہیں ہوسکتا کہ وہ دوسروں کی پولیٹیکل تعلیموں کے آگے جھک کر نیا راستہ پیدا کریں۔ ان کو کسی جماعت میں شامل ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ خود دنیا کو اپنی راہ پر چلانے والے ہیں۔ اور صدیوں تک چلا چکے ہیں۔" (مضامین آزاد حصہ دوم صفحہ ۱۹۱۲ء)

اب

"میرا انتخاب (صدارت کے لیے) درحقیقت مہاتما گاندھی کی قیادت پر اعتماد کا آئینہ دار اور اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ ملک اُنکے پروگرام سے بالکل متفق ہے" (اسٹیٹسمین ۲ جون ۱۹)

یعنی نہ میرا نظام اپنا ہے نہ اپنی کوئی حیثیت، پروگرام بھی گاندھی جی کا ہے۔ اور قیادت و امارت بھی اُنہی کی اب آپ خود فیصلہ فرمالیجیے۔ کہ مولانا صاحب خود اپنے الفاظ میں مُسلم رہتے ہیں یا کچھ اور

چنیں دورِ آسماں کم دیدہ باشد کہ جبریلِ امیں را دل خراشد
چہ خوش دیرے بنا کردند آنجا پرستد مومن و کافر تراشد

جب

"آپ فرماتے ہیں کہ پولیٹیکل مباحث کو مذہبی رنگ سے الگ کر دیجیے لیکن اگر الگ کر دیں تو ہمارے پاس باقی کیا رہ جاتا ہے ہم نے تو اپنے پولیٹیکل خیالات بھی مذہب ہی سے سیکھے ہیں ہم انھیں مذہب سے کیونکر الگ کر دیں؟ ہمارے عقیدہ میں تو ہر وہ خیال جو قرآن کے سوا اور کسی تعلیم گاہ سے حاصل کیا گیا ہو۔ ایک کفر صریح ہے اور پالٹیکس بھی اسی میں داخل ہے افسوس ہے کہ آپ حضرات نے اسلام کو کبھی بھی اسکی اصل عظمت میں نہیں دیکھا ما قدروا اللہ حق قدرہ۔ ورنہ اپنی پولیٹکل پالیسی کے لیے نہ تو گورنمنٹ کے دروازے پر جھکنا پڑتا۔ نہ ہندوؤں کی اقتدار کرنے کی ضرورت پیش آتی۔" (مضامین آزاد حصہ دوم ۱۹۱۲ء)

مولانا صاحب سے دریافت کیا گیا کہ کیا آپ کے پروگرام میں ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ بھی شامل ہوگا۔ تو انہوں نے فرمایا کہ ملک کے سامنے اصلی مسئلہ تو پولٹیکل ہے۔ اگرچہ ہندو مسلم مسئلہ کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ باینہمہ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ حصول آزادی کی جنگ خانگی معاملات کے حل تک ملتوی نہیں کی جاسکتی"۔ (اسٹیٹسمین، ۲۴ جون ۱۹)

یعنی حصول آزادی کی تحریک پولٹیکل ہے۔ اور ہندو مسلم اتحاد کا معاملہ غیر پولٹیکل۔ یہ پولٹیکل اور غیر پولٹیکل کی تقسیم واقعتاً ایک مسلمان کے نقطۂ نگاہ سے کیا معنے رکھتی ہے؟ اسے سنہ ۱۹۱۲ء والے مولانا آزاد سے پوچھیے

نقد و نظر

فہرست مطبوعات سررشتہ تالیف و ترجمہ

ہندوستان سے پہلے عربی گئی۔ پھر فارسی۔ (اور اگر خدا نکردہ ہندوؤں کے منصوبے بروئے کار آگئے تو اردو بیچاری بھی چند دنوں کی مہمان ہے) ہمارا علمی سرمایہ جو ہمارے اسلاف کی گراں بہا وراثت کی شکل میں ہم تک منتقل ہوتا چلا آرہا تھا۔ وہ زیادہ عربی اور اس کے بعد فارسی میں ہے۔ ان زبانوں کی عدم ترویج کے ساتھ وہ سرمایہ بھی زمین دوز خزانہ کی صورت اختیار کر رہا تھا۔ بارے ریاست حیدرآباد نے اس طرف توجہ کی اور اس گراں قدر سرمایہ کو اردو میں منتقل کرنا شروع کیا۔ زیرنظر فہرست اسی شعبہ کے کارہائے نمایاں کا آئینہ ہے جس کے لئے سررشتہ تالیف و ترجمہ کے ناظم جناب محمد الیاس صاحب برنی شکریہ کے مستحق ہیں۔ اگرچہ اس فہرست میں کتب انگریزی کے تراجم کا حصہ غالب ہے۔ لیکن عربی کی جن کتابوں کا ترجمہ کیا گیا ہے یا جو زیر ترجمہ ہیں (مثل طبقات ابن سعد) وہ اپنی اہمیت کے اعتبار سے بہت بلند پایہ ہیں۔ ہم اس باب میں اتنی گذارش ضروری سمجھتے ہیں کہ ان کتابوں کی قیمت ذرا کم رکھی جائے تاکہ صاحبان ذوق عام طور پر فائدہ اٹھاسکیں۔

مفردات القرآن

مولانا حمید الدین صاحب فراہیؒ کا ذکر سابقہ پرچہ کے نقد و نظر کے ضمن میں آچکا ہے زیرنظر رسالہ (عربی) انہی کی ایک مفید تالیف ہے۔ اس میں قرآن کریم کے چند مفرد الفاظ کے معانی نہایت تحقیق و کاوش سے متعین کئے گئے ہیں۔ اگر جناب مؤلف کی عمر ایفا کرتی اور وہ کم از کم اس کتاب کو ہی مکمل کر جاتے تو ہمارے علمی ذخیرہ میں گراں بہا اضافہ ہوتا۔ دائرہ حمیدیہ۔ سرائے میر۔ اعظم گڑھ نے اس رسالہ کو نہایت عمدگی سے شائع کیا ہے۔ (قیمت اس پر درج نہیں ہے)۔ لیکن اچھا ہوتا کہ اس کے ساتھ ہی اس کا اردو ترجمہ بھی شائع کر دیا جاتا۔ ہندوستان میں تنہا عربی سے فائدہ اٹھانے والے اب کتنے ہیں (اور جو ہیں ان میں کتابیں خریدنے کی استطاعت بہت کم ہے)

سلیم کے نام ...... تیسرا خط

ہاں، سلیم! مَوْءُدَہ کے معنے تم نے درست سمجھے ہیں۔ جاہلیت عرب میں یہ رواج تھا کہ لوگ اپنی لڑکیوں کو اپنے ہاتھوں زندہ درگور کر دیا کرتے تھے۔ قرآن کریم دنیا سے ہر قسم کی سبعیت و بربریت اور ہر نہج کا جور و استبداد مٹانے کے لیے آیا تھا۔ اس لیے یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ اس قسم کے وحشیانہ رواج کو باقی رہنے دیتا۔ چنانچہ اس نے اسے مٹا دیا اور چند ہی سال میں یہ بہیمانہ رسم کہ جس کے تصور سے انسانی روح کانپ اٹھتی ہے، صحیفۂ کائنات سے حرفِ غلط کی طرح نابود ہو گئی۔ قرآن کریم نے اپنے مخصوص دلکش اسلوب اور معجزانہ انداز سے اس کا ذکر فرمایا ہے کہ جب وہ معصوم بچی اپنے قاتل باپ کا دامن پکڑے بحضورِ داور داداراستغاثہ پیش کرے گی۔ تو مجرم سے کہا جائے گا کہ (بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ) بالآخر کس جرم کی پاداش میں اس بے کس و بے بس ننھی سی جان پر یہ ظلم ڈھایا گیا تھا۔ اس کا کیا جواب بن پڑیگا؟ ظاہر ہے!

مسلمان خوش ہیں کہ اسلام کی رحمتِ عامہ نے کس طرح اس لرزہ انگیز و وحشت خیز رسم کا سدِ باب کیا۔ اور بات ہے بھی فخر و مسرت کی لیکن سلیم! ذرا نگاہِ تعمق سے دیکھو گے تو تمہیں نظر آئے گا کہ وحشت و درندگی کی یہ انسانیت سوز رسم آج بھی دنیا میں موجود ہے۔ تم شاید حیران ہو گے کہ آج اس دورِ تہذیب و تمدن اس عہدِ علم و دانش میں وہ کونسی سرزمین بے آئین ایسی ہو گی جہاں اپنے ہاتھوں لڑکیوں کو زندہ درگور کر دینے کی رسم جاری ہو گی۔ لیکن تمہاری حیرت بیکرانہ ہو جائے جب تمہیں یہ بتایا جائے کہ یہ جگر پاش رسم آج خود ہمارے ملک میں ہماری قوم میں اور ہمارے گھروں میں رائج ہے۔ لیکن ہم ہیں کہ اپنی آنکھوں سے اس قسم کے خونِ ناحق کو دیکھتے ہیں اور محسوس تک نہیں کرتے۔ ہم قرآن کریم کے ان مقامات سے یہ کہہ کر گزر جاتے ہیں کہ یہ عرب کے ایامِ جاہلیت کی ایک بھیانک رسم کا تذکرہ ہے ہم اس سے بالکل متعلق نہیں ہیں۔ سلیم! تم جانتے ہو کہ قرآن کریم نے ہر قتلِ ناحق کو سنگین ترین جرم قرار دیا ہے۔ لیکن اس قسم کے قتل کو سب سے زیادہ وحشت ناک اسی لیے قرار دیا ہے کہ اس میں اس ایک کمزور و ناتوان بچی کو کس مپرسی۔ بے زبانی اور قوت مدافعت سے محرومی کا ناجائز

قلفدہ سنایا جاتا ہے۔ اب ذرا اپنے گرد و پیش نظر دوڑاؤ اور دیکھو کہ اس قسم کے کتنے خون ہر روز تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں اور لطف یہ کہ قاتل اپنی خون آلود آستینوں کو سینہ تان کر لیے پھرتا ہے اور تمہارے آئین وضوابط کا کوئی ہاتھ اس کی کلائی تک نہیں پہونچتا۔

سلیم! میں اس طلسم پیچ و تاب کا خوب اندازہ کر رہا ہوں جس میں ان سطور کے مطالعے سے تمہارا دل اُلجھ رہا ہے اور تمہاری وہ نگہ تجسس بھی میرے سامنے ہو جو اس قسم کے خونِ ناحق کے دھبوں کی تلاش میں ہر طرف پریشان پھر کر ناکام و نامراد اپنے نشیمن میں واپس آجاتی ہے لیکن میں حیران ہوں کہ تمہاری نگاہ واتنے اتنے دور و دراز گوشوں تک تو پہونچ رہی ہے لیکن اس چھوٹی سی بچی زبیدہ کی طرف نہیں اٹھتی جو اپنی ماں کی آغوشِ محبت سے محروم ہو کر اپنی نانی کے دامنِ عاطفت میں پرورش پا رہی ہے۔ تم نے غالباً اس بے چاری کی مرحوم ماں کو نہیں دیکھا۔ نہ ہی شاید یہ سنا ہوگا کہ اس کی موت کیسے واقع ہوئی حتیٰ کہ تمہیں شاید یہ بھی معلوم نہ ہوگا کہ یہ بچی اس رشید کی بیٹی ہے جو اگلے دنوں قماربازی کے اڈے سے گرفتار ہو کر حوالۂ قید و بند کیا گیا ہے۔ رشید کی یہ آوارگی کوئی نئی چیز نہیں یہ بچپن ہی سے ایسا تھا۔ ابھی خوردسال تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا جس قوم کی اجتماعی زندگی برباد ہو چکی ہو، اس کے یتیم بچوں سے اکثر یہی ہوتا ہے کہ یا تو وہ بھوکوں مر جاتے ہیں اور اگر گھر میں پرورش کا سامان میسر ہو تو چوں کہ کسی کا دستِ تادیب و تہدید سر پر نہیں ہوتا۔ اس لیے بالعموم آوارہ اور اوباش ہو جاتے ہیں۔ یتیمی کی حالت میں زندگی بسر کر کے اخلاق کا اعلیٰ نمونہ پیش کرنا فی الواقعہ ایک ازلی سعادت ہے۔ رشید بچپن میں ماں کا لاڈلا رہا۔ بڑا ہوا تو بُری صحبت میں پڑ گیا۔ اس کی آوارہ مزاجی کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ کبھی کبھار بڑے بوڑھے سمجھاتے بجھاتے بھی تھے لیکن باپ کا سادر کر بچے سے گالی کھا رہا ہے۔ لیکن اس کی خیراندیشی کی فکر نہیں چھوڑتا۔ ماں ہزار کڑھتی، لیکن اسکی سنتا کون؟

رشید آوارہ تھا۔ ناکارہ تھا، کوئی اسے پسند نہیں کرتا تھا لیکن نہ معلوم صابرہ کی ماں کے سر میں کیا سودا سمایا تھا کہ وہ صابرہ کی زندگی رشید کے سپرد کر دینے پر تلی بیٹھی تھی۔ اس کے گھر والے مخالف۔ عزیز رشتہ دار مخالف۔ ہمسائے اور اہل محلہ مخالف غرضے کہ جو بھی سنتا مخالفت کرتا۔ لیکن اس نے کچھ ایسا کانوں میں تیل ڈال رکھا تھا کہ کسی کی سنتی ہی نہ تھی۔ اور تو اور خود رشید اس تجویز کا مخالف تھا۔ لیکن اگر راضی تھی تو صابرہ کی ماں یا رشید کی صابرہ کی ماں سے جب بھی کوئی پوچھتا تو صاف کہہ دیتی کہ میں نے تو صابرہ اس وقت سے اپنی بہن

کو دے رکھی ہے جب یہ ابھی دودھ پیتی تھی۔ اس لیے اب یا تو اس کی ڈولی بہن کے گھر بھیجوں گی یا اس دہلیز سے اس کا جنازہ نکلے گا۔

صابرہ ایک متین، سنجیدہ، خاموش، سمجھدار لڑکی تھی۔ اور انتہائی بدبختی کہ پہلو میں ایک حساس دل رکھتی تھی۔ یوں تو معاشرتی پابندیوں کے خیال سے بھی کسی لڑکی کا اپنے رشتہ کے متعلق ایک لفظ بھی اپنی زبان پر لانا اتنا بڑا گناہ ہے جس کا کفارہ ہی نہیں۔ اس پر صابرہ کی خاموش پسند فطرت۔ ہاں ہمجولیوں سہیلیوں کی باتوں میں کبھی کبھی کنایتہً ظاہر ہو جاتا تھا کہ زندگی کا بھیانک مستقبل اس کی آنکھوں کے سامنے تھا اور اس کی ماں کی ضد اس کے نزدیک کھلا ہوا پیام موت۔ اس کی امیدوں کا آخری سہارا یہ خیال تھا کہ رشید چونکہ خود بھی اس رشتے کے مخالف ہے اس لیے شاید وہ اس جہنم سے بچ جائے لیکن ادھر رشید کی ماں کی ضد کہ بیٹا! اگر اس معاملے میں میری مرضی کے خلاف چلے تو یاد رکھو زہر کھا کر مر جاؤں گی۔ میں اپنی بہن کو قول دے چکی ہوں۔ اب اس سے پیچھے نہیں ہٹ سکتی نتیجہ یہ کہ دن مقرر ہو گئے۔ بارات آگئی۔ تمام رسومات ادا ہو گئیں۔ آخر میں رخصتانہ سے ذرا پہلے ایک اور رسم کا بھی خیال آگیا: نکاح خواں کو معلوم، گواہوں کو معلوم۔ خود دولہا دلہن کو معلوم کہ کس جبر و اکراہ سے یہ عقد باندھا جا رہا ہے۔ لیکن دولہا کو ماں کی ناراضگی کا خیال۔ دلھن کو معاشرتی بدنامی کا ڈر۔ گواہوں کو اپنی "چودھرپت" کا پاس۔ مولوی صاحب کو سوا روپیہ کا لالچ۔ ان تمام "مقتضیات شرعیہ" کے یک جا جمع ہونے کے بعد "منشائے خداوندی" کی تکمیل اور "سنتِ پیغمبری" کی تقلید میں اور کس چیز کی کمی رہ سکتی تھی۔ ایجاب و قبول ہوا خطبہ مسنونہ پڑھا گیا۔ لمبی لمبی دعائیں مانگی گئیں۔ شادیانے بجے۔ مبارکبادیاں ملیں۔ دلھن گھر میں آئی۔ گھر کی رونق بڑھی۔ سلیم! ذرا غور کرو کہ وہ رشتہ مناکحت جسے قرآن کریم نے عہد استوار (میثاق غلیظ) کہا ہو۔ جسے ایک محکم معاہدہ قرار دیا ہے۔ جس کے لیے بلوغت کی شرط عائد کی گئی ہے کہ فریقین برضا و رغبت پوری عقل و شعور کیساتھ معاملہ کے ہر پہلو پر کامل غور و خوض کے بعد اپنے مستقبل کے متعلق کسی فیصلہ پر پہنچیں۔ اس عہد و معاہدہ کو اس طرح سے استوار کرنا اگر شریعت حقہ سے کھلا ہوا استہزا اور دین مبین سے خالص تلعب نہیں تو اور کیا ہے۔ لیکن تمہارے ہاں تو نکاح سے اب مفہوم صرف اتنا رہ گیا ہے کہ رسماً و تبرکاً وہ چند الفاظ دہرا دیے جائیں جو نکاح خوان نے ایسی تقریب کے لیے زبانی یاد کر لیے ہیں۔ حالاں کہ ان الفاظ کی روح بھی اگر سامنے ہو تو ازدواجی زندگی کی ہزاروں پوشیدہ حقیقتیں بے نقاب ہو جائیں۔ اور ایک نکاح ہی پر کیا موقوف ہے۔ تمہارے

ہاں تو تمام کا تمام دین ہی ایک رسم ہو کر رہ گیا ہے جس میں زندگی کی کوئی رمق تک تم نے باقی نہیں رہنے دی۔ میں لکھ رہا ہوں اور ساتھ ہی اس خفیف سی ہنسی کو بھی محسوس کر رہا ہوں جو تمہاری آنکھوں میں شوخی بن کر مچل رہی ہے۔ اور کہہ رہی ہے کہ ابھی اگلے دنوں تو میں نکاح کے معاملہ میں دورِ حاضرہ کی آزادیوں کے خلاف لیکچر دے رہا تھا۔ اور آج اپنی قدیم معاشرت کی پابندیوں کے خلاف وعظ کہنا شروع کر دیا لیکن سلیم! بیشتر اس کے کہ تمہاری ہنسی قہقہہ بن جائے۔ اس بات کو یاد کرو جو میں نے اس دن کہی تھی کہ اسلام کا صراطِ مستقیم اعتدال کی راہ ہے۔

نہ اس میں عہدِ رواں کی حیا سے بیزاری

نہ اس میں عصرِ کہن کے فسانہ و افسوں (اقبالؔ)

اگر دورِ حاضر کی "مزعومہ آزادیاں" انسان کو پھر سے بہیمیت کی طرف لیے جا رہی ہیں تو تمہاری رسومِ قدیمہ کی پابندیاں بھی اسے اس حقیقی آزادی کی زندگی سے محروم کیے ہوئے ہیں جو اسلام کا منشا تھا۔ یاد رکھو! سکون و طمانیت کی جنت کا راز صرف قوانینِ الٰہیہ کی اس پابندی میں مضمر ہے جو ہزاروں فطری آزادیوں کی ضامن اور لاکھوں غیر فطری بندشوں کی ہادم ہے۔

ہاں۔ تو میں تمہیں بتا یہ رہا تھا کہ صابرہ کس اسلوب سے اپنے سسرال میں آئی۔ دن گزرتے گئے۔ اور یوں تو کوئی خاص واقعہ رونما نہ ہوا۔ لیکن ایک غائر نگاہ سے دیکھنے والا محسوس کرتا تھا کہ صابرہ کے چہرے سے شگفتگی و بشاشت آہستہ آہستہ ایک شاخِ خزاں دیدہ کے زرد پتے میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ ہر چند وہ اپنی سلیقہ شعاری۔ فطری ایثار اور جذبۂ خدمت گزاری سے رشید کو اس کی بدعنوانیوں سے روکنے کی کوشش کرتی۔ لیکن اس کا مرض ان تیمارداریوں کی حدود سے آگے بڑھ چکا تھا۔ رشید کی طرف سے بے رُخی اور بے اعتنائی تو پہلے دن سے تھی۔ رفتہ رفتہ یہ کشیدگی نفرت اور نفرت دشمنی میں تبدیل ہو گئی۔ گھر میں ساس کا دم صابرہ کی تسلی کا باعث تھا۔ لیکن چونکہ مصیبتیں تنہا نہیں آیا کرتیں۔ ایک برس بھی گزرنے نہ پایا تھا کہ وہ بھی چل بسی۔ اب جس قدر صابرہ بے بس تھی۔ رشید اسی قدر زیادہ آزاد۔ رفتہ رفتہ گھر کی آمد و رفت کم ہونے لگی۔ اکثر باہر رہتا۔ گھر میں اس کے لیے اگر کوئی وجۂ کشش تھی تو وہ صابرہ کے چار زیور تھے جب ضرورت پڑتی۔ آتا اور چھینا جھپٹی سے کچھ نہ کچھ کھسوٹ کر لے جاتا صابرہ کا باپ سیدھا سادھا غریب آدمی تھا۔ اگرچہ صابرہ کے لیے وہاں روٹی موجود تھی۔ لیکن صابرہ صحیح

معنوں میں صابرہ تھی۔ فاقوں پر فاقے آتے لیکن کیا مجال کہ دوسرے دروازے تک خبر ہو جائے۔ گلی کے باہر پیکا تھا۔ لیکن صابرہ نے کبھی ظاہر نہ ہونے دیا کہ اسے کوئی تکلیف ہے۔ چپکے چپکے کچھ مزدوری کرتی لیکن ایسی مزدوری بھی کون سی ہو سکتی تھی جس سے ایک مظلوم لڑکی مستقل طور پر اپنا گزارہ کر سکتی۔ دن رات ایک کر دیتی تو بمشکل ایک وقت کی روٹی میسر آتی۔ اللہ رکھے سارا محلہ اپنا تھا۔ سب قریبی رشتہ دار تھے۔ اس کے سامنے دوسرے گھروں میں ہزاروں نعمتیں آتیں لیکن وہ انکی طرف کبھی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی.................. کئی دفعہ ایسا ہوا کہ دو تین وقت کے فاقے کے بعد روٹی کا انتظام ہوا کہ رشید کہیں سے دندناتا ہوا آ گیا۔ صابرہ نے خاموشی سے روٹی اس کے سامنے رکھ دی اس نے روٹی کھائی۔ گالی گلوچ سے اس کا صلہ دیا کیا عجب کہ مار پیٹ تک بھی اتر آتا ہو) اور جو چیز گھر میں نظر آئی لے کر چلتا بنا۔

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی بتایا ہے۔ سارا محلہ رشتہ داروں کا تھا لیکن سلیم! انفرادی زندگی کی سب سے بڑی لعنت تو یہی ہے کہ مصیبت تنہا اسی کی مصیبت سمجھی جاتی ہے جس کے سر پر آ پڑے۔ صابرہ کا باپ، جیسا کہ تم نے دیکھا ہی ہے۔ ایک سیدھا سادھا غریب آدمی ہے۔ اس کے پاس شرافت کا آخری حربہ یہی تھا کہ وہ رشید کی منت سماجت کرتا۔ مقدور بھر اس کی خدمت گزاری کرتا۔ لیکن ایثار و قربانی کا اثر تو وہیں ہوتا ہے جہاں سرشت بد نہ ہو۔ رشید ان بچاروں سے یہ سب کچھ اپنا حق سمجھ کر وصول کرتا۔ اور الٹا ان کے سر پر احسان دھرتا۔ یہ سب کچھ تھا لیکن صابرہ کی زبان پر کبھی حرف شکایت نہ آیا۔ آتش خاموش نے اندر ہی اندر اس کی ہڈیوں تک کو خاکستر کر دیا لیکن کیا مجال جو اس نے اس کا دھواں ابھرنے دیا ہو۔ رات کی تنہائیوں میں رو لیتی۔ لیکن کسی کے سامنے آنکھوں کو نمناک بھی نہ ہونے دیتی۔ اس کا علم اس وقت ہوا جب تنہائیوں کے اس مسلسل رونے نے آشوب چشم کی صورت اختیار کر لی۔ دو ماہ تک بچاری کی آنکھیں دکھتی رہیں۔ آرام ہوا تو دیکھا کہ بینائی بے حد کمزور ہو چکی ہے۔ اب یہ اس مزدوری سے بھی معذور ہو گئی جس سے گزر اوقات ہو جاتی تھی۔ گھر میں جو کچھ تھا۔ رفتہ رفتہ رشید کی آوارگی کی نذر ہو گیا۔ اب صابرہ کا روگ چھپائے نہیں چھپ سکتا تھا۔ سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئی۔ سہیلیاں۔ ہمجولیں اسے سمجھاتیں کہ غم نہیں کھانا چاہیئے۔ ایسے فکر سے کیا بنتا ہے۔ وہ ان کی سنتی اور ایک ہلکے سے تبسم سے جو آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک سمجھنے والے کو سب کچھ کہہ دیتا بس کر چپ ہو جاتی۔ صابرہ کی حالت روز بروز خراب ہوتی چلی گئی

لیکن رشید کی بلا جانے کہ ایک قیمتی جان تلف ہو رہی ہے۔ پتہ نہیں اس بچاری کو کب سے تپ آ رہا تھا۔ لیکن اس نے کسی سے ذکر ہی نہ کیا۔ اب جس وقت وہ دن رات لازم رہنے لگا تو معلوم ہوا کہ تپ کہنہ ہے۔ جاڑے کا موسم تھا سخت سردی کے دن۔ ایک شام کسی نے آ کر ذکر کیا کہ تھانے والے رشید کو کسی آوارگی کے سلسلہ میں گرفتار کر کے لے گئے ہیں۔ اور دس روپے کی عدم ادائیگی میں حوالات میں دے رکھا ہے۔ صابرہ کی زندگی کا سہارا ایک گرم چادر تھی جسے وہ اوڑھے بیٹھی تھی چپکے سے اٹھی اور چادر ایک پڑوسن کے پاس بھیج دی۔ چادر اگرچہ قیمتی تھی لیکن اسے بمشکل دس روپے مل سکے۔ روپیہ لے کر رشید کے چچا کو دیئے کہ جرمانہ ادا کر دیں۔ اب اس کے پاس سردی سے بچنے کے لیے کپڑا بھی نہ رہا۔ تپ مزمن ہو گیا۔ زندگی چراغ سحری نظر آنے لگی۔ اس کی ماں اب بمشکل اسے اپنے ہاں لے آئی۔ جو کچھ بن پڑا۔ علاج معالجہ کیا۔ لیکن ؎

ہو غم ہی جانگداز تو غمخوار کیا کرے

صابرہ کو اب پہلے سے بھی زیادہ چپ لگ گئی۔ گھر والوں کو دوا۔ دعا کے لیے دوڑ دھوپ کرتے دیکھتی تو کسی سہیلی سے کہہ دیتی کہ انہیں سمجھاؤ کہ ؎

قصۂ غم نہ بڑھاؤ مجھے مر جانے دو

رشید، صابرہ کی بیماری میں کبھی بھولے سے بھی اُدھر نہ آیا۔ ایک دن نہ معلوم جی میں کیا آئی کہ چلا آیا اور صابرہ کے سرہانے آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے پلک اٹھائی۔ رشید کو دیکھا وہی غیر محسوس سا تبسم اس کی آنکھوں میں دکھائی دیا، جو درحقیقت تمہاری معاشرت کے خانہ ساز آئین وضوابط پر ایک بے پناہ تنقیدی نشتر تھا۔ قلب کا آب گینہ پگھل کر ایک شفاف آنسو کی شکل میں سر مژگاں چمکا۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔ ایک ہچکی آئی جس کے جھٹکے نے سازِ حیات کی آخری تاریں توڑ کر رکھ دیں اور صابرہ! آہ۔ غم و حرمان کی داستانِ خموش صابرہ! ہمیشہ کے لیے چپ ہو گئی۔

سلیم! تم کہاں ہو! سوچو تو سہی کہ کیا یہ اس موءِ دکہ سے کم انسانیت سوز اور دل گداز واقعات ہیں اور غور کرو کہ ایسی ایسی کتنی معصوم زندگیاں ہیں جو اس طرح گھل گھل کر تلف ہو رہی ہیں اور تمہاری سوسائٹی کو اس کا احساس تک بھی نہیں ہوتا۔ سلیم! تم کہہ دو گے کہ اس قسم کے مظالم سے نجات حاصل کرنے کے لیے اصلاحی قدم اُٹھ رہے ہیں

چنانچہ سال گزشتہ جس قانون خلع کا نفاذ ہوا ہے وہ اسی قسم کی مشکلات کا علاج ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس قسم کی اصلاحی تجاویز نیک ارادوں کی حامل ہوتی ہیں۔ لیکن ہوتا اکثر و بیشتر ایسا ہے کہ ایسی اصلاحات حقیقی ستم رسیدہ واقعات Genuine cases میں جائز فائدہ پہنچانے کے بجائے فریب کار لوگوں کے لیے ناجائز فائدہ اٹھانے کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ اور یہ اس لیے ہو کہ ہمارے اصلاحی اقدام علتِ مرض کے بجائے علاماتِ مرض کا علاج سوچتے ہیں جس مریض کا تمام خون خراب ہو چکا ہو۔ اس کے پھوڑے پھنسیوں پر مرہم لگانے سے کیا فائدہ ہوگا۔ ایک پھنسی دب جائے گی تو دوسرے مقام پر دو اور نکل آئیں گی۔ حقیقی علاج تو اس کے خون کی صفائی ہے۔ آج ہماری معاشرتی زندگی کا پورے کا پورا ڈھانچہ بگڑ چکا ہے اس لیے اس کا اصلی علاج اس کی تشکیل جدید ہے ازسرِنو تعمیر ہے۔ ایسی تعمیر جس کی بنیادیں قوانین کے الفاظ پر نہیں بلکہ قلوب کی گہرائیوں پر ہونگی کہ جب تک قلوب و اذہان تبدیلی نہیں ہوتی آپ کے نظام زندگی کا کوئی شعبہ درست نہیں ہو سکتا۔ اور قلوب کی تبدیلی تمام ماحول اور فضا کی تبدیلی پر منحصر ہے اور یہ تبدیلی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ آپ انسانی دماغ کے تراشیدہ نظام زندگی کے بجائے قوانین الٰہیہ کا متعین فرمودہ نظام حیات دنیا پر مسلط نہ کر دیں گے۔ سلیم سوچا کر یہ ایک گہری سوچ کی بات ہے۔ وَفِيهِمَا إِثْمٌ لِلنَّاسِ ۔ والسلام۔

پرویز

سندھ میں کیا گزری؟

خان بہادر اللہ بخش کی وزارت کے زمانہ میں سندھ کے مسلمان جن حوادث و آلام کا شکار بنتے رہے ہیں ان کا ذکر اخبارات میں آتا رہا ہے لیکن چونکہ ملک کا اخباری نظام کلیۃً ہندوؤں کے ہاتھوں میں ہے اس لئے مسلمانوں کے معاملات کے متعلق بہت کم صحیح خبریں باہر آتی ہیں۔ سید علی محمد صاحب راشدی۔ جائنٹ سکریٹری سندھ پراونشل مسلم لیگ کراچی۔ نے زیر نظر (انگریزی) پمفلٹ میں ان واقعات کو یکجا کیا ہے جو سندھ میں رونما ہوئے) ہر چند اسوقت

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

لیکن یہ پمفلٹ ان حضرات کی معلومات میں اضافہ کریگا جو یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ہندوؤں کو خوش کرنے کے لئے اس ننگِ اسلام "مسلمان" نے مسلمانوں کے ساتھ کیا کیا تھا۔ یہ پمفلٹ مؤلف سے بلا قیمت مل سکتا ہے۔ جس کے لئے ناشر۔ عبداللہ ہارون صاحب مستحق شکریہ ہیں۔

ترجمان القرآن کے متعلق چند باتیں (مؤلفہ ابوالکلام صاحب آزاد)

از حضرت مولانا نذیر احمد شاہ صاحب کاشمیری، کلکتہ

مولانا ابوالکلام صاحب آزاد۔ الہلال کے زمانہ میں ایک عالم قرآن کی حیثیت سے شہرت حاصل کر چکے تھے اور اسی زمانہ میں آپ نے قرآن کریم کی تفسیر لکھنے کا بھی وعدہ فرمایا تھا جس کا ایک زمانہ تک لوگوں کو انتظار رہا۔ ۳۱-۱۹۳۰ء میں جب انکے تفسیری ترجمہ "ترجمان القرآن" کی پہلی جلد شائع ہوئی تو پرانی عقیدت کی بنا پر لوگوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ایک تو ذہن میں پرانے نقوش۔ پھر مصنف کا شاعرانہ انداز بیان۔ اس پر مسلمانوں کی شخصیت پرستی۔ نتیجہ یہ کہ بلا سوچے سمجھے ملک میں چاروں طرف سے اس کتاب کی تعریف و ستائش میں آوازیں بلند ہو گئیں۔ جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے اس کتاب کے متعلق سب سے پہلی صحیح تنقید جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز کے قلم سے مجلہ معارف میں ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس مضمون میں پرویز صاحب نے صرف دو اصولی باتوں پر تنقید کی تھی۔ ایک تو یہ کہ مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ خدا کا تصور ذہن انسانی کے ارتقائی مدارج کے ساتھ ساتھ مکمل ہو گیا اور دوسرے یہ کہ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب عالم میں یکساں طور پر موجود ہیں۔ اس لیے کسی ایک مذہب کو دوسرے مذہب پر کوئی فوقیت حاصل نہیں۔ پرویز صاحب نے ان ہر دو خیالات کو تعلیم قرآنی کے خلاف ثابت کیا تھا۔ اس تنقید کے بعد ملک کے مختلف گوشوں سے پرویز صاحب کی تائید میں آوازیں بلند ہوئیں لیکن یہ بحث علمی تھی۔ اس کے بعد جب "واردھا کی تعلیمی اسکیم" شائع ہوئی ہے تو اس وقت معلوم ہوا کہ مولانا صاحب کی یہ تفسیر دراصل اس اسکیم کا پیش خیمہ تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ اس تفسیر کے ضروری حصص کے ہندی ترجمے کی خاص اشاعت کی گئی تھی۔ اس نقطہ کے متعلق طلوع اسلام میں متعدد بار لکھا جا چکا ہے

یہ اس تفسیر کا سیاسی پہلو تھا لیکن ابھی ایک گوشہ اور بھی تھا جس کی نقاب کشائی کی ضرورت تھی اور وہ یہ کہ علم تجزیۂ نفس کی روشنی میں دیکھا جائے کہ مؤلف نے جو کچھ لکھا ہے وہ مستشرقین یورپ کی طرح محض دماغی تفریح ہے یا اس کا منبع ایک قلب سلیم ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ موضوع بڑا دقیق ہے۔ اس لیے اس پر قلم اٹھانے کے لیے ایک غائر نگاہ کی ضرورت تھی۔ ہم اپنے بھائی جناب راغب احسن صاحب ایم۔ اے۔ سکریٹری ضلع مسلم لیگ، کلکتہ کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے طلوع اسلام کے لیے زیر نظر مقالہ حاصل کیا۔ یہ مقالہ فلسفیانہ مباحث پر مشتمل اور خالص علمی انداز میں لکھا گیا ہے اور چونکہ اس کا مخاطب اہل علم حضرات کا طبقہ ہے اس لیے یہ عام سطح سے بہت بلند ہو گیا ہے۔ سطح بین حضرات اسے غالباً خشک اور یقیناً مشکل پائیں گے۔ ہم چاہتے تھے کہ مختلف حواشی سے اسے اتنا آسان کر دیں کہ متوسط علمی طبقہ بھی اسے سمجھ سکے لیکن ہم نے دیکھا کہ یہ حواشی اصل مضمون سے کہیں بڑھ جائیں گے۔ اس لیے ہم نے اس کوشش کو چھوڑ دیا۔ اور یوں بھی خوشبو کی تلاش میں پھول کی پتیوں کا تجزیہ کرنا پھول کو مسل کر رکھ دینا ہوتا ہے۔ بہتر ہے کہ جو طبقہ اس مضمون کا مخاطب ہے وہی اسے سمجھے۔

بھائی راغب احسن صاحب نے صاحب مقالہ کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:۔

"شاہ صاحب ایک صاحب علم و عمل درویش صفت بزرگ ہیں۔ مجاہدانہ اور درویشانہ اوصاف ظاہری و باطنی سے ممتاز اور دین و ملت کے درد سے دردمند ہیں خدا نے نہایت اعلیٰ دماغ اور ذہن و فکر کی قوتوں کے ساتھ تقوے و تفقہ فی الدین کی دولتوں سے بھی مالا مال کیا ہے طبیعت میں فقیرانہ اور مجاہدانہ استغنا بہت زیادہ ہے۔ انگریزی سے بھی واقف اور زمانہ کی ضروریات و حالات سے پوری طرح باخبر ہیں۔ زبان اور قلم پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ مفکر ہیں لیکن خشک فلسفی نہیں بلکہ یہ ایک عملی مومن ہیں۔ طلوع اسلام کے بہت بڑے قدردان ہیں اور اس کی ترقی کے لیے دعا فرماتے ہیں۔ اس وقت شاہ صاحب کلکتہ کے ایک حلقہ حزب اللہ میں درس قرآن دیتے ہیں۔ امید ہے کہ وہ آئندہ بھی

طلوعِ اسلام کے لیے وقت نکال کر کچھ لکھتے رہیں گے "

طلوعِ اسلام ایک ایسے مردِ مومن کی دعاؤں پر جتنا بھی ناز کرے بجا ہے اور ان کی ذرہ نوازی کا جتنا بھی شکر گزار ہو، کم۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔ (طلوعِ اسلام)

کسی مذہبی تصنیف کے مذہبی ہونے کا ایک بڑا معیار یہ ہے کہ پڑھ لینے کے بعد طبیعت کا اندازہ کیا جائے اور دیکھا جائے کہ پڑھنے والے کے شوق نجات و ذوق استقامت میں ترقی ہوئی ہے، یا صرف دماغ پر کوئی عارضی کیفیت طاری ہوئی ہے۔ پہلی صورت میں یہ تصنیف مذہبی ہوگی اور دوسری صورت میں محض دماغی گورکھ دھندہ جو یقین کے بجائے تردد و ریب اور ضعف عمل کا موجب ہوگا۔ رسوخ عقائد کے ساتھ ارکانِ دین پر پابندی کرنے والے کے لیے ترجمان القرآن کا ہر ایک صفحہ انتشار عزیمت و ضعف عمل کے سوائے اور کوئی مادہ اپنے اندر نہیں رکھتا یہ کیوں؟ اسباب عرض ہیں۔

۲ دین و عبودیت کا قالب اطاعت و اتباع کا قالب ہے۔ اس کا ایک بازو خوف خدا اور دوسرا طمع من اللہ ہے۔ ایک پر رغبت اور دوسرا رہبت ہے۔ (یہ خوف و طمع اور رغبت و رہبت عالم آفاق کی سطح پر پھیلی ہوئی سراب حقیقت مسرتوں کے بجائے حیات ابدی و نجات اخروی سے زیادہ متعلق ہے "یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا" "یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ رَغَبًا وَّرَهَبًا" "رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ" - "انی اخشی کم واتقی کم من اللہ" (او کما قال)

ایک سادہ لوح طالب حق کے لیے قرآن وحدیث کا پورا ذخیرہ اسی حقیقت کا ترجمان ہے

مگر ترجمان القرآن کے رنگین تخیل مصنف کے خیال میں مذہب کی حقیقت عالم آفاق کی سطح پر پڑی ہوئی ایک عمیق نقابِ جمال و موزونیت کی مسلسل تعبیر اور پھر اسی کے بعض لاینفک گوشوں کے معنوی قوانین کے اظہار کے سوائے اور کچھ نہیں، مؤلف کا قلم حسن فطرت کی تعریف میں صفحوں کے صفحے رنگین کرتا چلا جاتا ہے۔ اور جب مطالعہ کنندہ کے اکثر اعتراضات (مذہب کے متعلق نہیں بلکہ کارخانہ فطرت کی کھردری سطح کی عدم موزونیت کے متعلق) رفع ہو جاتے ہیں تو تقویت مزید کے لیے اس موقع پر چند آیات نقل کر دی جاتی ہیں اور اس طرح حسن و عشق کی شاعرانہ

تعبیرات کے ایک نظر فریب باب کا کامیاب خاتمہ کر دیا جاتا ہے۔ اور اگر تحریر کے کسی ضمنی و ذیلی گوشے میں مذہب اور اس کی حقیقت کے متعلق کوئی ادھ معنی مستور ہوں تو اس کا کوئی اعتبار نہیں ہو سکتا۔ عام طرز نگارش اور سلسلۂ سیاق کس حقیقت تک پہنچاتا ہے۔ وہ مندرجہ صدر واقعیت کے سوائے اور کچھ نہیں۔

مسئلہ کی حقیقت کو مزید واشگاف کرنے کے لیے کچھ مزید عرض کیا جاتا ہے۔

وحی کا عالم خود ایک مستقل عالم ہے وہ نہ تو نیوٹن و ڈارون، ارسطو و بطلیموس کے بے شعور و بے نور عالم آفاق کے کسی گوشے کے لغوی قوانین کی تعبیر ہے اور نہ غزالی و ابن عربی رحمہا اللہ کے عالم انفس کے لطائف نورانی کا بیان ہے بلکہ جس صراط مستقیم پر کھڑے ہو کر ہم اس ابدیہ یوند یقین زار کے کچھ پرتو حاصل کر سکتے ہیں، وہ عالم انفس و آفاق کے عین وسط و بین بین واقع ہوا ہے۔ یہ صراط مستقیم عقائد حقہ کے رسوخ سے اور فرائض و واجبات۔ سنن و مستحبات پر استقامت سے بنا ہے۔ اجتناب منہیات و مشتبہات کی حدود سے دونوں جانب سے گھرا ہوا ہے۔ وحی الٰہی کی تقلید تام کے باعث جب اللہ تعالےٰ مرد مومن کو اس راہ پر استقامت بخشتا ہے تو اس کے سامنے "وَالْعَاقِبَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى" کی مادی ادراک کو تحلیل کرنے والی وسعتیں ہوتی ہیں اور دائیں بائیں عالم انفس و آفاق کے مناظر اس یقین زار نورانیت کی طرف دیوانہ وار بڑھنے کے لیے موید ہوتے ہیں۔ "اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا" الایۃ "وَفِيْ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ" آیات انفسی و آفاقی کی طرف توجہ دلانے سے شریعت حقہ کی غرض مسافرین راہ کی تقویت و تائید مزید اور منکرین کو الزام دے کر ان کی گستاخ جہالت کی روک تھام ہے کائنات خارجی و داخلی کے مناظر و آثار کو مستقل موضوع تفکر و تدبر بنا کر طبیعات و منطقیات اور شاعرانہ لٹریچر کے ذخائر مدون کرنا شریعت کا مقصود ہرگز نہیں (اگرچہ ضمناً ایسا ہونے کی شریعت میں گنجائش ہے کہ تسخیر کائنات کے لیے نوامیس فطرت کا مطالعہ ضروری ہے)

اس آزاد سوچ و بچار سے جس قسم کے خدا کا تصور قائم ہو گا وہ انسان کے اپنے خیالات کا تراشیدہ خدا ہو گا جس کا ماننا نہ ماننے سے کم خطرناک نہیں۔

اس موقع پر مؤلف ترجمان القرآن کی تفسیر سورۂ فاتحہ کے ان تمام مواقع کو دیکھا جائے جہاں مؤلف نے وحی کو اٹل قوانین فطرت کے اندر جکڑی ہوئی بے شعور و بے جان کائنات کے بعض ایسے ہی گوشوں کے معنوی

قوانین کی تفسیر سے تعبیر کیا ہے پھر اس پر بھی غور کیا جائے کہ اس کج بے یقین دماغ سے اس موقع پر شرافت و کرامت انسانی کا خیال تک کس طرح نکل گیا ہے اور اسے اشرف المخلوقات و کرم انسان کس طرح چیونٹی کوڑے کی طرح ذلیل مخلوق دکھائی دیتی ہے، جو اس بے شعور کارگاہ ہستی کا ایک لاینفک جزو ہے۔ مؤلف کے سلسلہ تحریر کی عام روکن نتائج تک پہنچاتی ہو۔ صرف اس پر نظر رکھی جائے۔ اگر اعتراضات سے بچنے کے لیے کونوں کھدروں میں اس کے خلاف کچھ اور بھی کہا گیا ہو، تو پایۂ اعتبار سے ساقط ہے۔ اس لیے کہ بے یقین افراد کا قدیم سے یہ ڈھنگ رہا ہے یہ ظاہر ہے کہ کسی چیز کا مفید و مضر ہونا اس کے بدیہی اور واضح پہلوؤں ہی کے اعتبار سے ہو سکتا ہے۔

۴ مؤلف ترجمان القرآن نے ذاتِ باری کے لیے تصورات کا جو قالب معین کیا ہے۔ اس کی یہ حیثیت ہے کہ اس نے ابتدائے کار میں کارگاہ ہست و بود کو پیدا کیا اس کے لیے قوانین کا ایک سلسلہ وضع کیا اور پھر سب کائنات کو ان قوانین کی تحویل میں دے کر اعلان کر دیا کہ ان قوانین میں کوئی تغیر نہ ہوگا۔ تغیر و تبدل میں گو اسے بظاہر کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہونا ہے۔ پھر بھی وہ اس اعلان کا اس طرح پابند ہو گیا ہے کہ اس میں تعطل کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ اعمال انسانی کی جزا و سزا انھیں اٹل قوانین فطرت کا ایک گوشہ ہے جس میں اپنے تعطل نما اعلان کے بعد اللہ تعالیٰ کسی طرح کے تغیر و تبدل کا روادار نہیں۔ وحی نے ہمیں اعمال و جزائے اعمال کے لزوم و اطراد پر مطلع کر دیا ہے۔ بس اس کی یہی مہربانی ہے۔ ان تمام مواقع کو بغور دیکھ کر پھر اصل حقیقت کو دیکھنا چاہیئے۔ زبان وحی نے ذات باری جل مجدہٗ کے متعلق ہماری کیا رہنمائی کی ہے، اس کی کیا حیثیت ہے اور اپنی صغیر و کبیر مخلوق سے اس کا کیا تعلق ہے۔ ایک سادہ فطرت انسان کے قلب پر (دماغ پر نہیں) الحمد للہ سے لیکر والناس کے سین تک پڑھ جانے کے بعد اس کا جو تصور پختہ ہو جاتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ نشیب و فراز کی دنیا کا خالق اور پھر اس کا آزاد مالک ہے مطلق (ہر پابندی سے آزاد) کا لفظ اس کی ہر صفت کا ضمیمہ ہے وہ جب چاہتا ہے جس چیز کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے۔ بدل دیتا ہے۔ اضافہ کر دیتا ہے۔ توڑ دیتا ہے اور بنا دیتا ہے۔ وہ فعال لما یشاء ہے وہ فعال لما یرید ہے۔ کامل الفطرت انسانوں کو اس پر اس قدر بھروسہ ہے کہ بقائے حیات سے لیکر روٹی، پانی اوڑھنے، بچھونے، یہاں تک کہ جوتی کے تسمے تک اس سے گڑگڑا کر مانگتے ہیں اور پاتے ہیں وہ اپنے ہاتھ پاؤں سے لیکر سورج چاند جیسے ٹھوس اسباب پر کوئی اعتماد نہیں رکھتے۔ وہ کسی سراب حقیقت اٹل قوانین فطرت سے

اور اس کی طرف کسی فعل کو منسوب کرنے سے ایسے ہی بے خبر ہیں جیسے سمندر کی تہ میں رہنے والی مچھلی صحرا کی تپش سے وہ موت کو، حیات کو۔ زلزلوں کو، مختلوں کو، سورج و چاند کے طلوع و غروب کو فضائے بسیط و بود کے جزو جزو کے بناؤ و بگاڑ کو، حرکت و سکون کو مستقل اللہ کا فعل دیکھتے ہیں اور بیان کرتے ہیں۔ اس کے ہمہ گیر فعل کا یہ نظارہ انھیں ہمہ تن خشیت و یقین کر دیتا ہے۔ سمع و گوش کے معین کردہ نتائج و مصالح کے پجاری بعض اوقات انھیں يَا أَيُّهَا الَّذِي نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ إِنَّكَ لَمَجْنُونٌ کہہ اٹھتے ہیں۔ مگر ان کی ایک ہی آواز ہے " اَللّٰہُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ " " وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ " " يَمْحُوا اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهُ أُمُّ الْكِتَابِ " فَعَّالٌ لِمَا يَشَاءُ۔ فَعَّالٌ لِمَا يُرِيدُ۔

بہرکیف مؤلف کے ذہین کے تتبع و تقلید میں بیان کردہ اٹل قوانین فطرت اور ان کے آزاد طبعی و اضطراری عمل کا کتاب و سنت کے اندر کوئی وجود نہیں۔ سنت اللہ کے لفظ سے مؤلف نے جو دھوکہ کھایا ہے یا اوروں کو اس میں گرفتار کرنے کی سعی کی ہے اس کے متعلق صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ یہ لفظ قرآن مجید کے اندر ایک خاص متعین معنے میں استعمال ہوا ہے " سرکش اقوام کو ان کے باغیانہ اعمال کی پاداش دینا " اس معنی کو کتاب اللہ میں لفظ سنت اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مؤلف ترجمان القرآن نے تخصیص محل کو بے دردی سے نظر انداز کر کے دجو تقلید وحی سے ہٹکر آزاد سوچ و چار کرنے والوں کا شیوہ ہے، اس مفہوم کو اٹل اور خود مختار قوانین فطرت سے تعبیر کیا ہے اور اس پر اپنے سب استدلال کی بنیاد رکھی ہے۔ اگر تخصیص محل کا خیال غلطی سے نظر انداز بھی ہو جائے پھر بھی خود سنت کا لفظ جس منطوق کی طرف قلب انسانی کی رہنمائی کرتا ہے وہ صاحب سنت کے اختیار کو عمق میں اسطرح مستور ہے کہ اسے ایک خارجی حقیقت نفس الامری قرار دے کر آزاد مشیت حق اور نتائج کے درمیان ایک روک کی حیثیت اٹل قوانین فطرت کے لفظ سے تعبیر کرنا پرلے درجے کی تحریف ہے۔ سنت کے معنی عادت کے ہیں عادت اور صاحب عادت میں جو ربط اختیاری ہے اُسے ہر ایک شخص سمجھ اور بوجھ سکتا ہے۔ مرد مومن کے نقطۂ نظر اور آزاد منطقیانہ سوچ و چار کے نتائج کے اندر اتنا اختلاف کیوں ہے کہ ایک سب کائنات کو خالق کائنات کے ہمہ گیر فعل کے عمق میں مستور دیکھتا ہے اور دوسرا بے شعور و لا یعقل قوانین فطرت میں ہر چیز کو قید پاتا ہے۔ اس کے جواب کو ظروف ادراک کے اندر تحلیل و ہضم کر لینے سے اکثر مبہمات دین بدیہیات ہو جاتے ہیں۔ وھوا ہذا۔

۵ انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے دو قسم کا شعور پیدا کیا ہے۔ ایک وہ حس مشترک ہے جس کا محل دماغ ہے اسے عقل حیوانی یا عقل معاش کہنا زیادہ موزوں ہے۔ یہ ایک مادی حس ہے جس کے ذریعہ انسان اپنی جسمانی ضرورتوں کی حیوانی کی طرح رہنمائی پاتا ہے۔ اس کی سرحد ادراک مادیات سے آگے کچھ بھی نہیں۔ یہ صرف زمان و مکان کی قیدی ہے کہ اندر کی جہت سے اپنی در و دیوار کو دیکھ لیتی ہے۔ یہی وہ حس مشترک ہے جس کے ارتقاء سے تمام فنون تجربانی و معاشی اور منطقی کی ایجاد و ترویج ہوتی ہے۔

دوسری وہ حس مشترک ہے جس کا محل قلب ہے اسے عقل معاد یا عقل انسانی کہنا زیادہ موزوں ہے۔ یہی وہ عقل ہے جو انبیاء علیہم السلام کی مخاطب ہے یہ ایک غیر مادی نور ہے جس کے ذریعہ انسان سعادت و شقاوت ازلی کو معلوم کر سکتا ہے۔ یہی خیر و شر کے اس امتیاز کو اپنے اندر جذب کر سکتی ہے جو بذریعہ وحی انسان کو تلقین کیا جاتا ہے۔ یہ جب پوری طرح بیدار ہو کر منشائے وحی پر کاربند ہو جاتی ہے تو نیوٹن اور بطلیموس کا دائرہ آفاق اور بعض حکمائے روحانی کا دائرہ انفس اپنی پوری وسعتوں کے ساتھ دو مختصر قوسوں کی شکل میں اسے اپنے یمین و یسار کی حد تک بڑھا ہوا معلوم ہوتا ہے اور پھر صراط مستقیم کی چند ابتدائی منزلوں میں ختم ہوتا دکھائی دیتا ہے اس سے آگے بے شوائب زمانیت و مکانیت یقین زار ابدیت کا ظہور ہوتا ہے "لھم قلوب یعقلون بھا" "فتکون لھم قلوب یعقلون بھا" "افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالھا" "فانہ نزلہ علی قلبک باذن اللہ" "بل ھو آیات بینات فی صدور الذین اوتوا العلم" میں یہی اور محض یہی عقل کا بیان ہے۔

یہی اور محض یہی عقل ہے جو وحی کو اپنے اندر جذب کر سکتی ہے اور وحی کی مخاطب ہے۔ مگر جن لوگوں کے اندر یہ عقل کم ہوتی ہے یا فطرت اللہ کی مسلسل مخالفت کے باعث نفس امارہ کی مغلوب و مقہور ہو جاتی ہے تو یہ لوگ وحی کے مفہوم کو بھی پہلی ہی عقل سے سوچنا شروع کر دیتے ہیں پھر کچھ تو وحی کے علم و یقین سے کلیتًا انکار ہی کر بیٹھتے ہیں جیسے بعض مادیین اور کچھ اس کے بعض افادی گوشوں کے سمجھنے میں کسی حد تک کامیاب ہو جاتے ہیں۔ جیسے بعض اخلاقیئیں مگر عقائد حقہ اور عبادت کا بڑا حصہ ان کے لیے چیستان ہی رہتا ہے۔ وحی کے منطوق کو سمجھنے میں اس قدر اختلاف کیوں ہے یہ بات سطور بالا سے معلوم ہو گئی ہو گی۔ اس قدر مزید اضافہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلی حس مشترک سے وحی کے ذخیرے کو سلجھانے کی سعی اس سے بھی زیادہ بے نتیجہ چیز ہے۔ جیسے ان کے ذریعہ محسوسات بصری کو

معلوم کرنے کی کوشش یا حس شامہ کے مدرکات کا لمس سے متعین کرنا۔ اب یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ترجمان القرآن کے بے یقین موقف کا نقطہ نظر بالکل عقل جسمانی کا نقطہ نظر ہے۔ جسے وہ پوری بے خبری مگر صحت کے ساتھ دائرہ محسوسات کا قیدی بتاتا ہو۔ اس کے نزدیک اس کا محل دماغ ہے۔ اسی لیے وہ وحی کو ایک مستقل عالم کے بجائے کائنات فطرت کے بعض گوشوں کے معنوی قوانین سے تعبیر کرتا ہوا اور انسانی قوتِ فکری کے ساتھ ساتھ مختلف ادوار ارتقا طے کرتا ہوا دیکھتا اور دکھاتا ہے۔ مگر یہ بات کہیں صراحتاً اس کے قلم سے نہیں نکلی کہ موسیٰ علیہ السلام و افلاطون، محمد رسول اللہ اور ہربرٹ سپنسر میں سے کس کی قوتِ فکری زیادہ ترقی یافتہ تھی۔ قوتِ فکری، ذہن، عقل، دماغ کے الفاظ مؤلف نے جہاں جہاں استعمال کیے ہیں۔ ان مواقع کو ایک بار دیکھ لینے سے اس کے یہاں عقل کے معنے متعین ہو جاتے ہیں۔ اب اس نے وحی کے بے پایاں سمندر کو اپنے پیمانۂ فکر (عقل جسمانی) سے کہاں تک ناپا ہے کس کس چیز کو سلجھایا ہے اس کا کچھ بیان پیراگراف ۲ کے اندر آچکا ہے۔

۶ کتاب و سنت کے اندر وحی کے سلسلے کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ مختلف وقتوں میں مختلف اقوام میں انبیاء و رسل آتے رہے اور راہِ نجات دکھاتے رہے آخر کار وحی الٰہی نے بین الاقوامی حیثیت میں ایک ہی مرکز سے ایک ہی خاتم الرسل کے ذریعہ تمام بنی نوع انسان کو فلاح ابدی کی صراط مستقیم کی طرف بلایا۔ گذشتہ انبیاء و رسل علیہم السلام کی تعلیم معنویت کے ساتھ ہی اپنا ظاہری قالب (الفاظ وحی) بھی کھو چکی تھی۔ جسے جامعیت ظاہری و باطنی کے ساتھ قلب رسول اللہ پر سرنو اتار کر اسکی حفاظت ظاہری کو بھی اللہ تعالیٰ نے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اپنے ذمے لے لیا اور اب صرف اسی مجموعہ ارشاد و دعوت کو سب بنی نوع انسان کی فلاح دارین کا ذریعہ قرار دیا "ان الدین عند اللہ الاسلام" "و من یبتغ غیر الاسلام دیناً فلن یقبل منہ" "الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا" "لو کان موسیٰ و عیسیٰ حیین لما وسعہما الا اتباعی" (او کما قال) یہ ایک سیدھی سادی حقیقت ہے جسکی کتاب و سنت نے دعوت دی ہے اور جس پر زمانہ خیر القرون سے لیکر اسوقت تک اجماع رہا ہے۔ اس موقع پر مؤلف ترجمان القرآن نے جس ہلاکت عظمیٰ کا ارتکاب کیا ہے اس کو بیان کرنے سے پہلے کتاب و سنت کے مقصودی مفہوم کو سمجھنے کی راہ سے ایک بڑی رکاوٹ کا دور کرنا ضروری ہے جو عام نگاہوں سے مستور اپنا عمل کرتی رہتی ہے۔ وحی کی حقیقت کو بدلنے اور اس کی معنوی تحریف کرنے کا ایک بڑا باعث، وحی کے مفہوم کو محض ادب و لغت کے

ذریعہ متعین کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ ان ہی کی زبان قومی کے اندر مخاطب فرماتا رہا ہے مگر سلسلۂ وحی میں استعمال شدہ الفاظ کے مقصودی مفہوم اور سابقہ لغت و ادب کے مفہوم کے اندر ایک جزوی مناسبت کے سوائے کوئی کلّی تطابق نہیں رہتا بلکہ شرعی استعمال میں اس ذخیرہ الفاظ کی حیثیت وضع ثانی کی ہوتی ہے جنہیں اپنی سابق حیثیت کے ساتھ ترادف کے بجائے اشتراکِ معنی کا تعلق ہوتا ہے، وحی کے علاوہ خود تمام فنون مخصوصہ کے ذخیرۂ اصطلاحات اور ان کے سابق لغوی منطوق میں بھی اس سے زیادہ اور کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔ پھر ان الفاظ کے ابتدائی استعمال (یعنے ادب و لغت کے مفہوم) کے مقابل آئندہ لگاتار استعمال میں خاص خاص خصوصیات کا اضافہ ہوتے ہوتے یہ الفاظ خاص شرعی اصطلاحیں بن جاتی ہیں جن کے بولتے ہی یہ سب خصوصیات مخاطب کے سامنے آجاتی ہیں۔ سلسلۂ تکمیل کی آخری حد کو پہنچنے پر وحی محمدی الصلوٰۃ۔ الزکوٰۃ۔ الدین۔ الاسلام کے الفاظ سے مخاطبین اولین کے قلوب میں کون سے معانی بداہۃً جاگزین ہوتے تھے۔ کن بدیہی مصادیق کی تلقین کے لیے انہیں جان و مال عزت و وجاہت تک قربان کر دینا پڑتا تھا اور پھر کن معانی پر اس وقت تک بطور مصطلح شرعیہ کے اجماع رہا ہے اس ہدایت کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اس تردد ریب بے یقینی و سوفسطائیت پر ایک نظر ڈال لی جائے جس کا اظہار مؤلف ترجمان القرآن نے "صراط مستقیم" کے تحت الدین الاسلام اور شریعت کے معنے میں کیا ہے۔ کس طرح ان کے منطوق شرعی کو نظر انداز کر کے ادبی عمومیتوں کو ان میں داخل کیا ہے اور پھر کس بیباک تکرار سے بار بار اس بات کو دھرایا ہے کہ وحی محمدی کی غرض ہر ایک مذہب کو اس کی اپنی اصلیت پر قائم کرنا ہے جو اختلافِ صوری کے ہوتے ہوئے بھی ہر دور کے اندر محفوظ رہی ہے اور محفوظ رہے گی اسلام حاشا و کلا کسی مخصوص اعتقادِ زائد کی تلقین نہیں کرتا۔ نہ کسی مخصوص ظاہری ہیئت کو ضروری گردانتا ہے بلکہ اس کا مقصد فی الفور پورا ہو جائے گا۔ اگر ظاہری ہیئت کذائی کے اختلاف کے باوجود تمام مذاہب اپنی اپنی حقیقۃ پر قائم ہو جائیں" العیاذ باللہ۔

یہ ہے وہ شخص جو موجودہ دور کے اندر مقام تجدید کے پردے اٹھانے کے لیے اپنے آپ کو مخصوص پاتا ہے اور جس نے چہرۂ مذہب پر ہزار برس کی پڑی ہوئی نقاب وضعیت کے اُلٹنے کا دعویٰ کیا ہے۔

جو شخص ابتدائے کار سے دین استقامت سے محروم ہو جس نے خشیت الٰہی سے لبریز قلب کے

بجائے رنگین شاعرانہ رجائی دماغ پایا ہو جس کی مجلس و موانست کفار و مشرکین، ملاحدہ و زنادقین کی ہر نوع کے افراد سے ہو۔ وہ دین کی حقیقت اس سے زائد اور کیا سمجھے گا۔ یہاں پر اس حقیقت کا اعادہ ضروری ہے کہ مؤلف کے آزاد طرزِ نگارش کا جزو جز ذایک صاف دل مومن کو بداہتاً جن نتائج تک پہنچاتا ہے وہ یہی ہیں۔ جس کے بعد کوئی ایسا عذر گناہ عنداللہ و عندالناس قابلِ پذیرائی نہیں ہوسکتا جو کسی ضمنی مفہومِ مستور کا سہارا لیکر دین کے اجتماعی عقیدے کو اپنا ہمنوا بنانے کی سعی کرے +

نقد و نظر

قانونچہ و دیگر پمفلٹ

ماہ رواں میں ہمیں مرکزی کلکتہ ضلع مسلم لیگ کی طرف سے بہت سے پمفلٹ موصول ہوئے ہیں جن میں سب سے زیادہ جامع وہ دستور نامہ ہے جس کا نام قانونچہ رکھا گیا ہے۔ اس لٹریچر کے مطالعہ کے بعد یہ حقیقت بین طور پر سامنے آجاتی ہے کہ اگر کسی مقام پہ اللہ کا ایک بندہ بھی صحیح بصیرت فرقانی اور جذبۂ ایمانی لئے بیٹھا ہو تو وہ ہمارے ملی اداروں کے ہر شعبہ میں کس قسم کی روح پھونک سکتا ہے۔ ضلع مسلم لیگ کلکتہ کے جنرل سیکرٹیری جناب راغب احسن صاحب۔ ایم۔ اے علمی اور سیاسی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ یہ تمام لٹریچر انہی کی کاوش و تدبر کا نتیجہ ہے۔ یوں تو یہ سب کچھ کلکتہ مسلم لیگ سے متعلق ہونے کی وجہ سے "مقامی" ہے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ تمام ملک کی مسلم لیگ کی شاخوں کے لئے اس لٹریچر کا مطالعہ ضروری ہے۔ جس کے بعد انہیں اس امر کا اندازہ ہوسکیگا کہ انہوں نے کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے۔ ہم اپنے مخلص بھائی جناب راغب احسن صاحب کی خدمت میں ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے ان دساتیر کی ترتیب سے وقت کی اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔ قانونچہ کی قیمت ۲ھ فی نسخہ ہے۔ اور باقی پمفلٹ غالباً مفت تقسیم کے لئے ہیں۔ کلکتہ مسلم لیگ کا دفتر ۲۵ ذکریہ اسٹریٹ میں واقعہ ہے۔

.... اصل میں دونوں ایک ہیں

[قارئین کو یاد ہوگا۔ کہ کچھ عرصہ ہوا ہمعصر مدینہ میں ایک سلسلہ مضامین شائع ہوا تھا جس کا عنوان تھا "مسلمان کیا کریں" اب کچھ دنوں سے اس اخبار میں ایک اور سلسلہ شروع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "ہندو مسلم اتحاد"۔ اس سلسلہ کی ابتداء ایک مقالہ افتتاحیہ سے ہوتی ہے جس میں معاصر مذکور نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں اگر "متحدہ قومیت" کی تشکیل نہیں ہو سکی تو اسکی ذمہ داری ہندو لیڈروں پر عائد ہوتی ہے۔ اس کے جواب میں مدینہ بابت ۱۲/۴ ۱۳ میں ایک صاحب کا مضمون شائع ہوا ہے جنہوں نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا لیکن جن کے متعلق مدینہ اخبار نے تحریر فرمایا ہے۔ کہ وہ ایک "ہندو کانگریسی لیڈر" ہیں۔ یہ مضمون تمہیدی حصہ حذف کر دینے کے بعد ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ اس سے ہماری غرض نہ تو معاصر مذکور کی توجہ اسکے موجودہ مسلک کیطرف مبذول کرانا مقصود ہے۔ کیونکہ اس قسم کے سلسلہ مضامین کی اشاعت سے معاصر مذکور کا مقصد سوائے "گرمی بازار" کے اور کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ نہ ہی ہمارا روئے سخن ان قومیت پرست مسلمانوں کیطرف ہے جن بیچاروں کا ذریعہ معاش ہی ان کی "نیشنلزم" ہے۔ ہم صرف ان مسلمانوں کی توجہ اسطرف منعطف کرانا چاہتے ہیں جو ابھی تک اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ مسلمانوں کے خلاف جن ہندوؤں کے سینے بغض و عداوت سے بھرے ہوتے ہیں وہ صرف "مہا سبھائی" ہیں کانگریسی ہندو نہیں ہیں۔ وہ حضرات اس مضمون کو ملاحظہ فرمائیں جو ایک "کانگریسی لیڈر" کیطرف سے شائع ہوا ہے اور خود ہی فیصلہ فرمائیں کہ کیا ایک مہاسبھائی اور کانگریسی ہندو میں اس باب میں کچھ بھی فرق ہے؟ اور اسکے ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھیے کہ۔ فَقَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ ۔ ۳:۱۱۸

انکے بغض و کینے (کی کچھ باتیں) تو انکی زبان پر آجاتی ہیں۔ اور جو کچھ انکے سینوں میں مخفی ہے وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہوتا ہے۔

طلوع اسلام]

سب سے پہلے تو میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں آپ کے آرٹیکلوں کی ہر بات کی مخالفت نہیں کرنا چاہتا اور نہ مناظرہ کرنے والوں کی طرح آپ کو منہ توڑ جواب دینے کے لئے یہ آرٹیکل لکھ رہا ہوں۔ یہ بات بالکل نہیں بلکہ بات

یہ ہے کہ میں نے آپ کا لیڈنگ آرٹیکل پڑھ کر ایسا سمجھا ہے کہ آپ ایمانداری کے ساتھ ویسا ہی سمجھتے ہیں جیسا آپ نے لکھا ہے۔ اس لئے میں بھی اتنا ہی چاہتا ہوں کہ جو کچھ میرا دل ایمانداری سے بولتا ہے اُس کی آواز بھی آپ کے اور آپ کی معرفت آپ کے خریداروں تک پہنچادوں۔ اس طریقے سے ہمیں کھرے اور کھوٹے کو چھانٹنے میں، آسانی ہوگی۔

آپ نے اپنے آرٹیکل میں ہندو جنتا کو دوشی نہیں بتلایا ہے بلکہ ہندو لیڈروں کے سر پر سارے دوش کا بوجھار کھا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ پچھلے پچاس ساٹھ برس کے زمانہ سے ہندوؤں میں ایسے لیڈر پیدا ہوئے جنہوں نے ہندو جنتا کو مسلمان جنتا سے دور دور رکھنے کا جتن کیا۔ آپ نے اس کے لئے آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند جی اور پنڈت مدن موہن مالویہ جی کا نام خاصکر کے لیا ہے۔ آپ کا خیال ہے کہ ہندوؤں میں رتن ناتھ اور دیا شنکر کے ایسے اردو ادب کو لکھنے والے اب ان ہی لیڈروں کے کارن پیدا ہونا بند ہو گئے آپ نے سر تیج بہادر سپرو اور پنڈت سندر لال جی جیسے لیڈروں کو "کلیہ توڑنے والا استثنا" کہہ کر گویا صبح کے وقت کا ٹمٹماتا ہوا دیا بتلایا ہے جو اب بجھا اب بجھا سی آر داس اور پنڈت موتی لال نہرو کا نام بھی آپ نے لیا ہے۔ مگر یہ دیئے تو اب بجھ ہی چکے۔ اور آپ کا خیال ہے کہ اب اس قسم کے دیوں کے دوسری مرتبہ جلنے کی کوئی آشا نہیں۔ آپ نے مہاتما گاندھی اور پنڈت مدن موہن مالویہ اور ان کے سوا دوسرے ہندو نیشنل لیڈروں پر یہ جرم بھی لگایا ہے کہ ان کو اردو آتی تھی مگر انہوں نے پراچین بھارت کے عشق میں اسے چھوڑ کر ہندی کے نام سے ایک ایسی زبان بولنا اور لکھنا شروع کی جو خود ان ہی کی پیدا کی ہوئی ہے اور جو پچھلے پچاس ساٹھ برس پہلے نہ تو کہیں بولی جاتی تھی اور نہ لکھی جاتی تھی۔ آپ نے ہندی اردو کے جھگڑے کو سارے جھگڑوں کی جڑ بتلایا ہے اور آخر میں یہ کہا ہے کہ چونکہ اب ہندو لیڈر اپنی ان کوششوں میں بہت آگے نکل چکے ہیں اس لئے اب یہ ناممکن ہے کہ وہ پچھلے پاؤں لوٹ کر اسی جگہ واپس آجائیں جہاں سے چلے تھے۔ جب ایسا نہیں ہو سکتا تو آپ کے خیال میں مسلمان پاکستان بنانے پر مجبور ہیں آپ کی ساری دلیلوں کا آخری مطلب یا خلاصہ یہ ہے کہ اس وقت ہندوستان میں جو ہندو مسلم جھگڑے چل رہے ہیں اور مسلمانوں میں مسلم فیڈریشن اور مسلم انڈیا کا جو خیال پیدا ہو رہا ہے۔ اس کی ذمہ داری ہندو لیڈروں پر ہے۔ اور اب

مسلم انڈیا کا بنجانا یقینی ہے مگر اس کے بنانے والے ہندو ہوں گے ایسا آپ سمجھتے ہیں ۔

آپ نے جن باتوں پر اپنی دلیلوں کی بنیاد رکھی ہے اس کا مطلب میری سمجھ میں یہ آیا ہے کہ آپ چاہتے تھے کہ ہندو مسلم اتحاد اور ہندوستان کی ایکتا یعنی کھنڈ بھارت کا خواب اسی وقت سچا ہو سکتا تھا جب ہر ہندو "فسانہ آزاد" کے محرر پنڈت رتن ناتھ یا "گلزار نسیم" کے ناظم پنڈت دیا شنکر کی طرح ہو جاتا ۔ لیکن آپ کی اس بات پر غصہ کئے بغیر میں پورے زور کے ساتھ یہ کہوں گا کہ آپ کے اس خیال کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کے لئے ہندو اپنا دھرم، اپنا کلچر اور اپنا تمدن سب چھوڑ دیتے ۔ میں پنڈت رتن ناتھ یا پنڈت دیا شنکر کو ادھرمی نہیں کہتا اور نہ اُن کو برا سمجھتا ہوں ۔ لیکن یہ بیشک کہتا ہوں کہ وہ ویسے ہندو نہیں تھے جیسے ایک ہندو کو ہونا چاہیے ۔ آپ ہی بتلایئے کہ جب وہ ہندو تھے تو ان کے خیالات کی جڑوں کو گیتا، مہا بھارت اور ویدوں کی زمین پر جما ہوا ہونا چاہیئے تھا اور ان کے قلم اور زبان سے جو کچھ نکلتا اُسے ہندو کلچر میں ڈوبا ہوا ہونا چاہیئے تھا ۔ لیکن انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اسے ہندو کلچر سے کوئی لگاؤ نہیں ۔ اُسے تو یوں سمجھئے جیسے انگریزی راجیہ کے اثر سے آج کل کے بعض ہندو انگریزی میں کتابیں لکھ رہے ہیں تاکہ یورپ میں ان کی قدر ہو ۔ اسی طرح اس زمانہ کے کچھ ہندو مسلمان راجیہ کے کارن مسلمانوں کی زبان میں بولتے تھے ۔ آپ رتن ناتھ اور دیا شنکر پر بہت اچھلتے ہیں ۔ لیکن میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اُسے مسلمان ہی جانتے ہیں اور وہی پڑھتے ہیں ۔ ہندو جنتا کو اس کا کچھ پتہ نہیں بالکل ویسے ہی جیسے مسز سروجنی نائیڈو نے انگریزی میں جو نظمیں لکھی ہیں ان کو انگریز بڑی ہی قدر کی نظر سے دیکھتے ہیں اور انگریزی لٹریچر میں ان کا ذکر خاص کر کے کیا جاتا ہے لیکن ہندو جنتا کو اس کا پتہ بھی نہیں ۔ لیکن اگر آپ کی دی ہوئی دلیلوں کو مان لیا جائے تو انگریز بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب تک سارے ہندوستانی مسز سروجنی نائیڈو کی سی زبان نہ بولنے لگیں گے ہم ان کو اپنا دوست نہیں سمجھیں گے ۔

پیارے بھائی! بھول نہ جایئے کہ ہندوؤں کی ایک اپنی مستقل زبان تھی، ان کا ایک مستقل کلچر تھا ان کا ایک مستقل دھرم اور ان کا ایک مستقل زندگی کا قانون تھا جس پر وہ چل رہے تھے ۔ اب

یہ دوسری بات ہے کہ وہ اچھا تھا یا بُرا لیکن تھا۔ جب مسلمانوں نے ہندوستان پر حملے کئے تو ان کا کلچر اور دھرم بھی اس سے نہ بچ سکا۔ بہت سے ہندوؤں نے جب ہار مانی تو ہتھیاروں کے ساتھ اپنی بُدھی کو بھی فاتحوں کے چرنوں میں ڈال دیا۔ مگر اس پرکار کے ہندو بہت تھوڑے تھے۔ اس سے بھی زیادہ تھوڑے جتنی اٹو پر سفیدی۔ لیکن راج چونکہ مسلمانوں ہی کے ہاتھ میں تھا اس لئے انھوں نے اسی پرکار کے ہندوؤں کو اچھالنا شروع کیا۔ اسی پرکار کے ہندوؤں کو جاگیریں دیں، منصب دیئے، پنج ہزاری اور شش ہزاری بنایا اور خوب ابھارا۔ ایسے ہی جیسے آج کل انگریز کر رہے ہیں۔ جہاں کسی نے انگریزی پڑھ لی اور سات ساگر پار سے کوئی دُم چھلا اپنے نام کے ساتھ لگا لایا اور اُس کی پوجا ہونے لگی۔ اب جدھر دیکھو وہی وہ دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اگر آج انگریزی سرکار ہمارے دیش کو چھوڑ دے تو کیا پھر بھی ہم اسی طرح انگریزی پڑھیں گے؟ کبھی بھی نہیں ہم اسے فوراً چھوڑ دیں گے۔ یہی بات آپ فارسی اور فارسی کی بچی اردو کی سمجھ لیجئے برا نہ مانئے ایک زمانہ تھا جب انگریزی کی جگہ مسلمانوں نے لے رکھی تھی۔ اس لئے آج جیسے ہندوؤں میں جواہر لال اور شاستری جیسے ادیب پیدا ہو رہے ہیں ویسے ہی اس زمانہ میں دیا شنکر اور رتن ناتھ کے ایسے اردو اور فارسی ادیب پیدا ہونے لگے تھے۔ مگر آج کے ادیبوں کی انگریزی سے ہندو جنتا کو کوئی آرگینک سمبندھ ہے اور نہ کل کے ادیبوں کی اردو فارسی سے کوئی آرگینک سمبندھ تھا۔ جس طرح انگریز کے چلے جانے کے بعد ہم انگریزی چھوڑ دیں گے، اسی طرح مسلمانوں کے راج کے اٹھ جانے کے بعد ہم نے اردو فارسی چھوڑ دی۔ لیکن اب آپ بگڑتے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس میں بگڑنے اور ناک بھوں چڑھانے کی کون سی بات ہے۔

ہاں اب سوال یہ ہے کہ پھر ہندو مسلم اتحاد کیسے ہو۔ تو سنئے جناب! ہندو مسلم اتحاد ایسے ہو جیسے چین میں ہوا ہے یا جیسے آریوں نے ہندوستان میں آ کر غیر آریہ نسلوں سے کیا۔ آپ کا یہ کہنا میں مانتا ہوں کہ مسلمانوں کی طرح آریہ بھی ہندوستان میں حملہ کر کے آئے ہیں اور یہ بھی مسلمانوں کی طرح پردیسی ہیں۔ مگر آریوں اور مسلمانوں میں بڑا بھاری فرق ہے۔ آریوں نے یہاں آ کر ہندوستان ہی کو اپنی جنم بھومی سمجھ لیا اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ یہیں کی گنگا جمنا کو انھوں نے پوتر مانا، یہیں کے بنارس اور ہردوار کو مقدس

سمجھا اور نہیں کیا جو کچھ کیا۔ مگر مسلمانوں کی حالت یہ نہیں ہے۔ وہ اب تک ہندوستان کو اپنا گھر نہیں سمجھتے اور فلسطین، عراق، عرب اور مصر کے مقابلہ میں ہندوستان کو ذلیل سمجھتے ہیں۔ مولانا محمد علی کا انتقال لندن میں ہوا لیکن دفنائے گئے وہ فلسطین میں اور کسی ایک مسلمان نے بھی یہ نہ کہا کہ ہندوستان کے لیڈر کو ہندوستان میں دفناؤ۔ جس مسلمان سے پوچھو یہی کہتا ہے کہ "سبحان اللہ صاحب بڑے مقدر والے تھے جو ایسی پاک مٹی نصیب ہوئی"۔ اس کا مطلب کیا ہے؟ یہی کہ ہندوستان کی مٹی ناپاک ہے یا اتنی پاک نہیں جتنی فلسطین کی۔ اسی طرح میں دیکھتا ہوں کہ ہر مسلمان یہی تمنا کرتا ہے کہ اس کی موت عرب میں تاکہ اس کی لاش اسی زمین میں گاڑی جائے۔ یہ کیا ہے؟ کیا اسی کو وطن کی محبت کہتے ہیں؟ کسی مسلمان سے میں نے یہ نہ سنا کہ وہ ہندوستان کے کسی مقام پر مرنے یا وہاں کی زیارت کرنے کی تمنا کرتا ہو۔ جسے دیکھو یہی پکار رہا ہے کہ ؎

میرے مولا بلا لو مدینے مجھے

میں کہتا ہوں کہ کیا اسی منہ سے مسلمان ہندوستان کو اپنا وطن کہنے کا دعویٰ کرتے ہیں؟ مولانا حسین احمد اتنے بڑے نیشنلسٹ ہیں۔ لیکن نام کے ساتھ "مدنی" لکھتے ہیں اسی طرح کروڑوں مسلمان ہیں جن میں سے کوئی اپنے کو شروانی کہتا ہے، کوئی ترمذی کہتا ہے، کوئی بخاری کہتا ہے کوئی قندائی کہتا ہے، کوئی اصفہانی کہتا ہے، کوئی سبزواری کہتا ہے، اور تو اور خان عبدالغفار خاں تک کو فخر ہندوستان کے بجائے فخر افغان کہا جاتا ہے۔ جیسے ہندوستان کوئی گنہگاروں کی بستی ہو کہ چاہے رہتے رہتے یہاں پیڑھیاں بیت جائیں اور چاہے شروان اور بخارا میں ان صاحب کے خاندان کا کوئی اتا پتا تک نہ ملے لیکن پھر بھی شروانی اور بخاری کی تختی گلے میں لٹکا رکھی ہے کہ ہندوستان کی ناپاکی سے جتنی نفرت کا اظہار ہو جائے اتنا ہی بہت ہے۔ شاید خدا اسی پہ بخش دے۔

آپ نے یہ سمجھانے کے لئے بہت جتن کیا ہے کہ مسلمانوں میں پان اسلام ازم کے خیالات ویسے نہیں ہیں جیسے ہندو کہتے ہیں۔ میں مانے لیتا ہوں بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ ان میں پان اسلام ازم ہونا چاہئے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ مسلمان ہندوستان سے باہر کے مسلمانوں سے ہمدردی نہ کریں۔ کریں

اور خوب کریں۔ لیکن ہندوستان کو اپنا وطن بھی تو سمجھیں۔ فارسی کی ایک مثل ہے کہ پہلے خویش، بعد میں درویش۔ لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے درویش اور پھر خویش، فلسطین کے لئے وہ لڑتے ہیں، خلافت کے لئے انھوں نے لڑائی کی مگر نہیں لڑتے تو ہندوستان کے لئے، جب سے کانگریس بنی ہے اکیلے ہندو ہی ہندوستان کی آزادی کی لڑائی لڑ رہے ہیں آپ نے اس سلسلہ میں غدر ۱۸۵۷ء اور پٹنہ اور انبالہ کی "خفیہ تحریک" کا چرچا کر کے یہ سمجھایا ہے کہ مسلمانوں نے بھی ہندوستان کی آزادی کے لئے جانیں دی ہیں۔ مگر وہ تو صرف مسلمانوں کی آزادی چاہتے تھے۔ وہ تو مغل خاندان کی سی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ اُس لڑائی میں انھوں نے ہندوؤں کو ساتھ نہیں لیا۔ آپ کو کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملے گی جب مسلمانوں نے ہندوؤں کو ساتھ لیکر یہ کوشش کی ہو کہ ہندو مسلمان سب آزاد ہو جائیں اور پھر ہندوستان میں جنتا کا راج ہو۔

لیکن جب سے کانگریس بنی ہے تب سے برابر ہندوؤں کی یہ کوشش رہی ہے کہ مسلمانوں کو بھی آزادی کی لڑائی میں ساتھ رکھا جائے۔ چنانچہ آج سے ۵۲ سال پہلے دوسری یا تیسری کانگریس کا صدر مسلمان کو بنایا گیا تھا۔ پھر بار بار مسلمانوں کو یہ کرسی دی گئی۔ مگر مسلمان ہمیشہ ہندوؤں سے کترا تے رہے۔ تقسیم بنگال کے سوال پر کتنے ہندو نوجوانوں نے اپنی زندگی کی بہار کو دیش کے لئے ناش کیا۔ لیکن مسلمان بالکل دم سادھے بیٹھے رہے۔ اور پھر یہ مسلمان ہی تو تھے جنھوں نے ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ بنا کر ہندوؤں سے بالکل الگ ہونے کا جھنڈا اٹھایا اور جداگانہ انتخاب کے لئے وائسرائے کے چرنوں میں سر رکھا پھر بلقان کی لڑائی میں ترکوں کے لئے مسلمانوں کے دل میں درد اٹھا، خلافت کے لئے وہ بے چین ہوئے مگر ہندوستان کا نام جب آیا تو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ مسلمانوں میں اگر غیرت ہو تو انھیں اس تاریخی بات کا خیال کر کے ڈوب مرنا چاہیئے کہ خلافت میں ہندوؤں نے مسلمانوں کا ساتھ دیا لیکن جوں ہی خلافت کے تخت کو کمال پاشا نے کونے میں رکھ کر ڈیماکریسی قائم کی اور مسلمانوں کو ٹکا سا جواب دیا دوں ہی مسلمانوں نے ہندوستان کی آزادی سے بھی ہاتھ اٹھا لیا اور جیسے چڑیاں پھُر سے اڑ جاتی ہیں ایسے کانگریس سے نکل بھاگے۔

مگران باتوں کو جانے دیجئے۔ ہمیں تو یہ سوچنا ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ صرف ایسے ہو سکتا ہے کہ مسلمان ہندوستان کو اپنی جنم بھومی اور ماتر بھومی سمجھیں اور یہاں کی چیزوں سے لگاؤ پیدا کریں اور اس کی زمین کو گندگی اور گھناؤنی نہ سمجھیں بلکہ ویسی ہی پاک اور پوتر سمجھیں جیسی فلسطین والے فلسطین کی زمین کو، ایران والے ایران کی زمین کو، مصر والے مصر کی زمین کو اور ترکی والے کو ترکی کی زمین کو سمجھتے ہیں۔ اگر مسلمان ایسا سمجھنے لگیں تو پھر سارے جھگڑے منٹوں میں ختم ہو جاتے ہیں۔ پھر نہ مسلمانوں کو سنسکرت سے چڑ ہو گی اور نہ دھوتی، بندے ماترم یا ترنگے جھنڈے سے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر بقول آپ کے مسلمان نے افغانستانی یا ایرانی جبے قبے چھوڑ کر ایک نیا لباس پہن لیا ہے تو پھر کیا حرج ہے اگر وہ دھوتی پہننے لگیں؟ کیا حرج ہے اگر سنسکرت پڑھنے لگیں؟ کیا حرج ہے اگر ہندی رسم الخط اختیار کر لیں؟ کیا حرج ہے اگر بندے ماترم کے گیت میں ہندی دیویوں کے جو نام محض تشبیہ اور استعارہ کے طور پر آئے ہیں ان کو سننے لگیں؟ کیا دھوتی پہننے والا، سنسکرت پڑھ کر ہندی رسم الخط کو استعمال کرنے والا، بندے ماترم کے گیت کو سننے والا اور ترنگے جھنڈے کو اپنا جھنڈا سمجھنے والا انسان مسلمان نہیں رہ سکتا، کیا پھر وہ قرآن شریف کا مطلب نہیں سمجھ سکتا۔ کیا پھر اپنے نبی کے احکام پر چلنا اس کے لئے ناممکن ہو جاتا ہے؟

یہ ہے ہندو مسلم اتحاد کا صحیح حل۔ اور اسی حل کو حاصل کرنے کے لئے ہندو بے چین ہیں۔ کوئی ایک ہندو لیڈر بھی یہ نہیں چاہتا کہ مسلمانوں کو ہندو بناوے۔ ہاں یہ ضرور چاہتا ہے کہ مسلمان ہندوستانی بنیں، ہندوستانی تاریخ پڑھیں، ہندوستانی زبان سیکھیں اور ہندوستانی رسم الخط اختیار کریں۔ اگر مسلمان ایسا نہیں چاہتے تو اسکا مطلب یہ ہے کہ وہ نہ تو ہندوستان کو اپنا وطن سمجھتے ہیں اور نہ ہندوؤں کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہتے ہیں۔ آپ کا دل پاکستان بنانے ہی کو چاہتا ہے تو بنا لیجئے۔ لیکن ہمارے سر پہ چھیدا رکھ کیوں بناتے ہیں۔ لیکن اُن کروڑوں مسلمانوں کا کیا بنے گا جو ہندو ہندوستان میں رہتے ہیں؟

دنیا میں اپنے کو فضول کوئی مصیبت میں نہیں ڈالا کرتا جب کسی مصیبت کو آدمی

قبول کرتا ہے تو اس کے سامنے کوئی آئیڈیل یعنی آدرش (اردو میں اعلیٰ نظریہ) ہوتا ہے۔ اگر کوئی آدرش سامنے نہ ہو تو پھر کوئی اپنے آرام کو نہیں چھوڑتا۔ اس وقت ہندوستان میں جو لڑائی چل رہی ہے اس کا آدرش دیش بھگتی ہے۔ ہم اپنی جانیں اس لڑائی میں اس لئے قربان کر رہے ہیں کہ ہم اپنے دیش کو آزاد کرکے اسے ہر پکار سے خود مختار بنا دینا چاہتے ہیں۔ ہم کسی بات کے لئے بھی ہندوستان کے باہر بھیک کا کٹورا لیکر جانا نہیں چاہتے۔ ہمارا آدرش یہ ہے کہ زبان ہو تو ہماری، رسم الخط ہو تو ہمارا، حکومت کا طریقہ ہو تو ہمارا، لیکن مسلمان چاہتے ہیں کہ زبان ہو تو عرب اور ایران کی، رسم خط ہو تو قرآن کا اور حکومت کا طریقہ ہو سب سے نرالا، آپ کی اس بات کو کوئی ہندو لیڈر بھی نہیں مان سکتا۔ مہاتما گاندھی تو خیر کیا مانیں گے، جواہر لال اور ایم این رائے جیسے ادھری بھی اسے نہیں مان سکتے۔ ہاں مسلمان اپنے لئے چاہیں تو اردو کے نام سے فارسی عربی جو چاہیں لکھیں اور بولیں لیکن جب سارے ہندوستان کی قسمت کا سوال آئے گا تو پھر وہ اس قسم کی چیزوں کو ہمارے گلے نہیں باندھ سکتے۔ ہندو کوئی مذہب نہیں بلکہ ہندوستان کی سوسائٹی کا دوسرا نام "ہندو" ہے ہندو میں سب مذہب سما سکتے ہیں۔ جس طرح جین سکھ، بودھ وغیرہ وغیرہ سینکڑوں مذہب الگ الگ ہونے پر بھی ہندو کے لفظ میں شامل ہیں اسی طرح اگر مسلمان ہندوستان کو اپنا وطن سمجھتے ہیں تو انھیں ہندو سوسائٹی میں داخل ہونے پر بھڑکنا چھوڑ دینا چاہیئے۔ جس طرح چین کے مسلمان مسلمان ہونے پر بھی چینی سوسائٹی میں داخل ہیں اور عقیدہ کے سوا کسی بات میں چینیوں سے مختلف نہیں اسی طرح مسلمانوں کو ہندوستان میں رہنا چاہیئے۔ مسلمان ہندو کے لفظ سے اتنے چڑتے کیوں ہیں؟ ہندو ہونے پر بھی وہ مسلمان رہ سکتے ہیں جیسے سکھ اور جینی۔ کانگرس میں مہاتما گاندھی نے یہی کیا ہے کہ سارے ہندوستان کو اس خاص معنی میں ہندو بنا دیا جائے۔ اسی لئے وہ ہندی پرچار کر رہے ہیں۔ وہ کسی مذہب کے مخالف نہیں مگر اس مذہب کے ضرور مخالف ہیں جو ہندوستان کی ایکتا کا دشمن ہے۔ ہندوستان کی ایکتا ہی کا نام دوسرے شبدوں میں "ہندو" ہے۔ کانگریس اور گاندھی جی دونوں چاہتے ہیں کہ ہر مذہب اپنے اپنے عقیدے پر قائم رہے لیکن ہندوستان کی بڑی سوسائٹی میں سب

"ہندو" رہیں۔ آپ ہندو نہ کہیے "ہندی" کہا کیجیے۔

ہندوستان کی نجات صرف اسی طرح ہو سکتی ہے۔ سر سپرو یا ڈاکٹر عبدالحق کی اس نصیحت سے نہیں ہو سکتی کہ سب ہندو ہندی چھوڑ کر اردو اختیار کر لیں۔ گویا جو عمارت برسوں کی محنت سے بنائی گئی ہے اُسے ڈھا دیں۔ اگر اس طرح آزادی بھی ملے تو ہندو اُسے نہیں لے سکتے۔ مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ مسلمان اس کے لئے تیار نہیں ایسی صورت میں آپ کا یہ خیال ٹھیک ہے کہ ہندوستان ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا میں بٹ جائے گا لیکن اسکی ذمہ داری ہندوؤں پر نہیں مسلمانوں پر ہوگی آخر میں یہ کہوں گا کہ میں نے یہ مضمون بہت کوشش کر کے آپ کی زبان میں لکھا ہے۔ لیکن پھر بھی میں ہندوستانی ہوں اس لئے آپ کی سی عربی، فارسی زبان نہیں لکھ سکتا۔ اس لئے کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معافی دیدیجیے گا۔

(ایک چھوٹا سا ٹکڑہ ایک دوسرے صاحب کے مراسلہ کا بھی ملاحظہ فرمالیجیے جو مدینہ اخبار کے اسی پرچہ میں دوسری جگہ شائع ہوا ہے۔)

"مسلمانوں کو میناریٹی میں ہونے کی وجہ سے رعایتیں دینی چاہئیں اور اُن کے ساتھ بڑے پن کا برتاؤ نہ کرنا چاہیے۔ یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے اور اسی لئے میجارٹی نے ان کے ساتھ رعائتیں بھی کی ہیں مگر مسلمان جو چاہتے ہیں وہ میجارٹی کے لئے خطرناک ہو سکتا ہے۔ شمال میں مسلمانوں کی کثرت ہے اور وہاں سے ملا ہوا اسلامی حکومتوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا ہے۔ مسلمانوں کی پان اسلامسٹ ذہنیت کو دیکھتے ہوئے یہ کچھ دور نہیں کہ وہ ہندوستان کے ہندوؤں کے خلاف ایران اور افغانستان وغیرہ سے سازش کر کے محمود غزنوی کی طرح حملے کریں۔ ہندو میجارٹی کا یہ خطرہ بہت خاص توجہ کا حقدار ہے۔ گاندھی جی بھی اسے نظر سے اوجھل نہیں کرتے "

نقد و نظر

دولت عثمانیہ | دار المصنفین اعظم گڈھ نے تاریخِ اسلام کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اس کا تذکرہ گذشتہ پرچہ میں آچکا ہے۔ زیرِ نظر کتاب اسی سلسلہ کی (غالباً آخری) کڑی ہے۔ درمیانی کڑیاں ابھی زیرِ ترتیب ہیں۔ اس کتاب میں سلطنت عثمانیہ کے عروج و زوال کی تاریخ اور جمہوریۂ ترکیہ کے کارناموں کی تفصیل جناب محمد عزیر صاحب ایم۔ اے (علیگ) نے نہایت شرح و بسط سے لکھی ہے۔ اور جب یہ چیز سامنے رکھی جائے کہ یہ اس کتاب کی جلد اول ہے تو اس امر کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ مولف نے اس باب میں کس قدر مواد اکٹھا کیا ہے۔ کتاب محنت سے لکھی گئی ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ باعتبارِ تفصیل اردو زبان میں دولتِ عثمانیہ کی تاریخ سے متعلق یہ اپنی نوع کی پہلی کتاب ہے۔ طباعت و کتابت کے لئے دار المصنفین کا نام ہی کافی ضمانت ہے۔ حجم ۴۹۰ صفحات۔ قیمت ے۲ فی نسخہ۔ جلد اول میں ۶۸۷ھ سے لیکر ۱۲۲۳ھ تک کی تاریخ آگئی ہے۔

تاریخ اخلاق اسلامی | یہ کتاب مولوی عبد السلام صاحب ندوی کی تالیف اور دار المصنفین اعظم گڈھ کی شائع کردہ ہے۔ طباعت۔ کتابت کاغذ عمدہ۔ حجم ۴۰۲ صفحات۔ قیمت ۱۲؍

مولوی عبد السلام صاحب کا ارادہ ہے کہ جسطرح مغرب میں تاریخِ اخلاق کی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اسلامی اخلاق کی تاریخ سے متعلق بھی ایک سلسلہ شائع کیا جائے۔ یہ اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے اس میں ایام جاہلیتِ عرب اور عجم کے اخلاق کی سرسری بحث کے بعد اخلاقِ قرآنی کا ذکر ہے۔ اور اس کے بعد نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ سے اس اخلاق کی عملی مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ کتاب نہایت سلیقہ سے لکھی گئی ہے۔ اور اگرچہ بعض فرعی باتیں محلِ نظر ہیں لیکن بہ ہیئت مجموعی مفید ہے۔

اخلاق کسے کہتے ہیں! یہ موضوع بہت طول طویل ہے اور جداگانہ بحث کا محتاج۔ لیکن ایک چیز بالکل واضح ہے کہ ہمارے ہاں اخلاقی دائرہ وسیع ہوتے ہوتے عام آداب و رسوم معاشرت کو بھی محیط ہو گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہاں جب کبھی اخلاق کا ذکر آتا ہے تو آنکھوں کے سامنے آدابِ معاشرت

کی تفصیل آجاتی ہے۔ اور ہمارے ہاں نصابِ اخلاق میں جو کتابیں داخل ہیں (مثلاً اخلاق محسنی اور اخلاق جلالی وغیرہ) ان میں زیادہ بحث ان آدابِ معاشرت کی ہوتی ہے جو اس زمانہ میں بالعموم رائج تھے۔ جو باتیں اس زمانہ میں عمدہ خیال کی جاتی تھیں انہیں اخلاقِ حسنہ قرار دیا جاتا تھا۔ اور جنہیں مذموم تصور کیا جاتا تھا انہیں اخلاق رذیلہ کی صف میں لے آتے تھے۔ اخلاق کے اس عجمی تصور کے برعکس قرآن کریم جس چیز پر نگاہ رکھتا ہے وہ انسان کی قلبی کیفیت (Attitude of mind) ہے جسکا جامع نام تقویٰ ہے۔ اور جس کی بنیادیں ایمان باللہ خشیتِ الٰہی اور انابت الی اللہ پر استوار ہوتی ہیں۔ یہ ہے اسلامی اخلاق کا اصول اور اس اصول کی عملی تشریح ہے اس ذاتِ گرامی مرتبت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حیاتِ مقدسہ کا ایک ایک مبارک لمحہ جسے بارگہ ایزدی سے

انک لعلی خلق عظیم

کی درخشندہ سند عطا ہوئی۔ لہٰذا مسلمانوں کے لئے تو اخلاق حسنہ و رذیلہ کی پہچان کا ایک اور صرف یہی ایک معیار ہے جو اخلاق اس معیار پر پورا اترتا ہے۔ حسنہ ہے۔ جو ایسا نہیں ہے ٹھکرا دینے کے قابل ہے خواہ دنیا اپنے اپنے معیاروں کے مطابق اسے کچھ ہی کیوں نہ قرار دیتی ہو۔ ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ ؎

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست ٭ اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

کتاب زیرِ نظر کے دیباچہ میں مولف نے لکھا ہے کہ

"اس غرض سے میں نے قرآن و حدیث اور تصوف اور اخلاق کے علاوہ تاریخ و ادب تذکرہ و تراجم شعر و شاعری غرض ہر قسم کی کتابوں کا مطالعہ کیا اور ان کتابوں کے مطالعہ سے جو معلومات حاصل ہوئیں اگرچہ وہ بالکل تشفی بخش تو نہ تھیں تاہم یہی مناسب معلوم ہوا کہ ان سب کو جمع کر کے اسلامی اخلاق کی تاریخ کا ایک خاکہ قائم کر دیا جائے تاکہ اور لوگوں کو اسمیں نقش آرائی کا موقع ہے"

ہم نہیں سمجھ سکے کہ اگر اخلاق اسلامی سے متعلق قرآن کریم اور کتب حدیث سے جو معلومات حاصل ہوئیں وہ بھی مولف کے نزدیک تشفی بخش نہیں۔ تو تشفی بخش معلومات اور کہاں سے حاصل ہونگی؟

سلسلۂ مطبوعات اِدارۂ طلوعِ اسلام

سوراجی اسلام

ہندوستان میں کانگریس کی حکومت قائم ہونے کے بعد مسلمانوں کو کس قسم کی مذہبی آزادی ملے گی یہ اُسکا ایک خاکہ ہے۔ صاحبِ بصیرت مصنف نے کانگریسی ہندو اور قوم پرست مسلمانوں کے اعمال و الفاظ سے اس امر کا صحیح اندازہ کیا ہے۔ کہ آنیوالے دور میں اسلام اور مسلمانوں پر مذہبی نقطہ نظر سے کس قسم کی شرائط و قیود عائد کی جانیوالی ہیں۔ گاندھی۔ جواہر لال نہرو۔ اور دیگر قائدین ہنود و کانگریس کی تصنیفات کے اقتباسات اپنی اس پیشین بینی کے ثبوت میں مُہیا کیے ہیں اور مولانا ابوالکلام آزاد کی قوم پرستی سے پہلے اور بعد کے واقعات اور تحریروں سے مُنہ بولتے ہوئے نظریئے۔ اور غلط روش کی ایسی دھجیاں بکھیری ہیں کہ آپ کو اسکا جواب نہ مل سکے گا۔ اسلامی جماعتی زندگی کی اہمیت و ضرورت پر آپ کو اس سے بہتر سند مشکل سے ملے گی۔ کارکنانِ کانگریس کے مواعید اور افعال کا وسیع اختلاف اس حُسنِ خوبی سے واضح کیا گیا ہے کہ اسے پڑھنے کے بعد کوئی مسلمان کانگریس اور اُسکے حوارین پر اعتماد نہ کرسکے گا۔ صرف دو آنہ کے ٹکٹ بھیجکر دفتر طلوعِ اسلام بلیماران۔ دہلی سے حاصل کر لیجیے۔

زبان کا مسئلہ

کانگریس نے حکومت کے نشہ میں سرشار ہو کر مسلمانوں کی تہذیب و تمدن۔ بلکہ مذہب کے رجحانات کو برباد کرنیکی جو کوششیں کی ہیں۔ اُن میں مُلکی زُبان کو بدل دینے کا کچھ کم حصہ نہیں۔ اُردو جیسی مستند زبان اور اُسکے مسلّم رسم الخط کو ہندی اور دیناگری کے غیر مانوس الفاظ اور طرز تحریر سے بدلنے کا فیصلہ بڑے بڑے کانگریسیوں کا اس پر عمل و اصرار پوری توجہ کے مستحق ہیں۔ بہ صفحات کے اس مقالہ میں آپکو حسب ذیل اہم نکات پر ایک نہایت بسیط اور مفید تبصرہ ملے گا۔

زبان اور رسم الخط کے اثرات اقوام و ملل کی تعمیر و تخریب۔ گاندھی جواہر لال نہرو۔ سمپورنانند۔ اور نام نہاد مسلم قوم پرست حضرات ابوالکلام آزاد وغیرہ کی کوششیں ہندی ترویج کے لیے۔ مسلمانوں میں ہندی کی جبری تعلیم۔ متحدہ قومیت۔ متحدہ زبان کے رُوح فرسا اور رجائیت آمیز نتائج۔ ہندی کی تعلیم کے پردے میں ارتداد کی تبلیغ۔ مسلمان بچوں میں ہندی پڑھنے کے مفاسد کا انعقاد۔ اسکے مطالعہ سے آپ محسوس کرینگے کہ آنیوالے ہندوستان کی زبان کے متعلق آپکے کیا فرائض ہیں اور یہ کہ اُن فرائض سے اغماض آپکی قوم کو تباہی اور ہلاکت کے کس عمیق غار میں لیجائیگا۔ یہ مختصر سا رسالہ اس قابل ہے کہ ہندوستان کے ہر مسلمان کی نظر میں رہے۔ صرف ڈیڑھ آنہ کے ٹکٹ بھیجکر دفتر طلوعِ اسلام بلیماران دہلی سے طلب فرمایئے۔

وارد ہا کی تعلیمی اسکیم اور مسلمان!

ہندوستان کی طرزِ حکومت میں آنے والے تغیر کے ساتھ ساتھ اس ملک کی طرزِ تعلیم میں بعض تبدیلیوں کی ضرورت بھی محسوس کی جارہی ہے۔ کانگریس اور اُسکے مسلمان ہم نواؤں نے اس سلسلہ میں ایک ایسی اسکیم تیار کی ہے۔ جس سے ہندوستانی مسلمان ابدالآباد تک ہندوؤں کے غلام رہ سکیں۔ کارپردازانِ طلوعِ اسلام نے اس اسکیم کے ترکیبی عناصر کا باحسن وجوہ تجزیہ کیا۔ اور ایک تفصیلی تنقید سے یہ ثابت کر دکھایا کہ یہ اسکیم مسلمان قوم کے لیئے تباہی۔ بربادی اور تخریب کا سرچشمہ ہے۔ اسکیم زیرِ بحث پر سب سے پہلی سب سے کامیاب اور سب سے زیادہ مستند کتاب ہے۔ اس میں خاص اسکیم کے علاوہ آپکو بہت سے عمومی مسائل پر نہایت بصیرت افروز اور ایمان افزا نکتے نظر آئینگے۔ مثلاً کسی ملک کی طرزِ تعلیم کا اثر اقوام کی حیات و ممات پر، ہنود کی اکثریت کا اثر ہندوستان کی اقلیتوں (بالخصوص مسلمانوں) پر، متحدہ قومیت کے جاذبِ نظر اور پر شکوہ جال کا اثر اقوامِ ہند پر۔ گاندھی جی کی نظر فریب، تقیر نشی اور پُر از تلبیس مہاتما بُت کا اثر وارد ہا اسکیم پر، وغیرہ وغیرہ ❊

مصنف نے مذاہب کا تقابل نہایت بلیغ اور پُر اثر انداز میں کیا ہے، اسلام میں جہاد کی ضرورت اس کی وجہ جواز، اُسکے افادات اور مجاہدین کی عزّت و عظمت پر دلنواز پیرایہ میں زور دیا ہے۔ کتاب کی طرزِ تحریر نہایت دلنشین۔ اندازِ نگارش قابل ستائش دلائل مسکت اور قاطع۔ اور انتخاب اقتباسات بیحد موزوں۔ یہی وجہ ہے کہ اُسکے متعدد ایڈیشنوں کی ہزارہا کاپیاں بِک چکی ہیں مختلف زبانوں میں اسکے تراجم شائع ہوچکے ہیں اور تشنگانِ ادب و معلومات کی تشنگی تاحال کم نہیں ہوسکی ❊

ہر مسلمان کے لیئے اسکا مطالعہ مذہبی، تعلیمی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے ازبس ضروری ہے۔ اور اسکو سارے ملک کے مسلمانوں تک پہنچانے کی غرض سے صرف ایک آنہ میں تقسیم کیا جارہا ہے۔ دفترِ طلوعِ اسلام بلی ماران دہلی سے طلب فرمایئے۔ اور اپنے احباب اعزا اور غیر مستطیع علم دوست مسلمانوں میں تقسیم کیجیئے جن کی حیات کا مدار آئندہ طرزِ تعلیم پر ہے۔ اور جنکو اسکے خطرات سے آگاہ کرنا آپکا فرض ہے ❊

عرضداشت بخدمت علمائے کرام وبزرگان عظام

مارچ ۱۹۳۹ء میں جمعیۃ العلمائے ہند کا ایک اجلاس دہلی میں منعقد ہوا۔ وقت کی نزاکت اور ملتِ اسلامیہ کی مشکلات کے پیشِ نظر کارکنان طلوعِ اسلام نے جمہور مسلمین کے نقطۂ خیال کو اِس مختصر سے پمفلٹ کے ذریعے علماء کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اور اُن سے التماس کی کہ یا تو وہ اِس نقطۂ نظر سے اتفاق کا اعلان فرمائیں ورنہ بصورتِ اختلاف اپنے مسلک کا جواز بالتفصیل قرآن وسنت کی روشنی میں واضح کر دیں۔ اِس رسالہ میں کانگریس کے مسلک، مسلمانوں کے کانگریس میں عدم شمول۔ غیر اسلامی متحدہ قومیت کے عدم جواز، مسلمانوں کی جماعتی زندگی کی اہمیت۔ کانگریس کے ماتحت ملنے والی آزادی کے عدم حصول اور ہنود کے مسلم آزار اور مذہب کش رویہ پر خالص قرآنی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے اور اِس سے بیک نظر معلوم ہو سکتا ہے کہ حکومت کے تغیر کے ساتھ مسلمانانِ ہند کن مشکلات میں آنے والے ہیں۔ فاضل مصنف نے ایک اچھوتے اسلوب بیان کے ساتھ تہذیب وشرافتِ اسلامی کو اپنا شعار بنایا ہے۔ آپ اِس رسالہ میں مکتبِ اسلامی کی تمام موجودہ ضروریات کی تفصیل مطالعہ فرمائیے صرف ۱۲ آنہ میں دفتر طلوع اسلام بلیماران دہلی سے طلب کیجیے

مسلم لیگ کا بنیادی مطالبہ

متحدہ قومیت کے غیر اسلامی تخیل پر ایک سیر حاصل تبصرہ پڑھنا ہو تو ہماری کتاب مسلم لیگ کا بنیادی مطالبہ کا مطالعہ فرمائیے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ مسلمان غیر مسلموں سے ملکر کسی جماعت، ادارہ یا قومیت کی بنیاد نہیں رکھ سکتا۔

جس میں قرآن کریم کے صریح اور متین ارشادات کی روشنی میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ جو مسلمان انفرادی یا اجتماعی طور پر غیر مسلم حضرات سے وداد و موانست کے تعلقات قائم کرتا ہے وہ قرآنِ حمید کے احکام کی خلاف ورزی کا مجرم و قابل مواخذہ ہے۔

اِس مختصر سے رسالے کے مطالعہ سے آپ معلوم کر سکیں گے کہ کانگریس کی تخلیق اور اُس کی تعمیر میں مسلمانوں کی شرکت کلام الٰہی کے منشائے مبارک کے خلاف ہے۔ مسلمانوں کے وہ خود ساختہ نمائندے جو کانگریس میں شعبہ اسلامیات بناتے پھرتے ہیں۔ آج تک اِس رسالہ کے محکم وقاطع دلائل وبراہین کا جواب نہیں دے سکے۔ صرف ۲ آنہ میں دفتر طلوع اسلام۔ بلیماران دہلی سے منگوائیے اور ہر مسلمان تک پہنچائیے کہ فرزندانِ توحید اپنا فرض پہچانیں۔

خدا کی بادشاہت

کرۂ ارض سے زر اور زمین کی ناہموار تقسیم۔ دفائن و خزائن کی ناجائز ملکیت۔ سرکشی و تمرد کے انسانیت سوز فتنے۔ اور جوع الارض کا لاعلاج مرض دُور کرنا ہو تو اس کتاب کو پڑھیئے جو مساوات، حریت اور عدل کے گم گشتہ اسباق کی یاد دلاتی ہے۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سرکارِ دو عالم تاجدارِ مدینہ نے استخلاف فی الارض کا جو عدیم المثال تصور پیش کیا تھا۔ اور جس کی تکمیل قرآن مجید کی آیات بیّنات نے فرمائی تھی۔ اُسکے بغیر اس دُنیا کو امن و اطمینان نصیب نہیں ہوسکتا۔ اور یہ کہ عیوب و اسقام سے پاک طرزِ سلطنت صرف وہی ہے جسکا خاکہ کلام الٰہی میں دیا گیا ہے۔

قیمت ۱۰ روپیہ صرف ڈاک کے ٹکٹ بھیجکر دفتر رسالہ طلوعِ اسلام بازار بلی ماران دہلی سے طلب فرمایئے۔

متحدہ قومیت اور مولانا حسین احمد صاحب

حضرت علامہ اقبالؒ کے نظریۂ قومیت کے جواب میں مولانا حسین احمد نے ایک پمفلٹ شائع کیا تھا' چونکہ علامہ اقبالؒ کی وفات کے چند ماہ کے بعد یہ جواب منظر عام پر آیا تھا۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت مولانا نے نہایت غور و فکر کے بعد اس کو مرتب فرمایا تھا اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے اسکا ایک جواب شائع ہو یہ رسالہ "متحدہ قومیت اور مولانا حسین احمد صاحب" اسی کا مدلل اور مسکت جواب ہے جس میں مشرح و بسط کے ساتھ مولانا مدنی کے دلائل کا جواب کتاب و سنت کی روشنی میں دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اسلام میں متحدہ قومیت کا تصور کیا ہے۔ اور ہندی لغت میں اسکی کیا تشریح ہے۔ اسلام کا نظریہ فرنگی یا ہندی نظریہ سے کس طرح متصادم ہوتا ہے مغرب کے ایجاد کردہ قومی تصور میں کیا کیا مفاسد پوشیدہ ہیں' یہ کتاب آجکل کے جملہ قومی و سیاسی مباحث کے لیے قول فیصل کا حکم رکھتی ہے۔ قیمت صرف ۲ر علاوہ محصولڈاک

اسلام اور مذہبی رواداری

رسالہ کا مضمون اُس کے نام سے ظاہر ہے مشرقی اور مغربی غیر مسلم مصنفین نے اسلام اور مسلمان خلفا وسلاطین کے خلاف عدم رواداری کا جسقدر شدید پروپیگنڈا کیا ہے۔ اُس نے واقعات اور تاریخ کے چہرے پر ایک سیاہ چادر ڈالدی ہے جس کی وجہ سے اکابر اسلام کو تنگ نظر، جابر اور مذہب کے دیوانے سمجھا جا رہا ہے۔ اس رسالہ کے مصنف نے مستند غیر مسلم مصنفین کی تصنیفات کے اقتباسات سے یہ ثابت کیا ہے، کہ مسلمان فاتح، حکمران اور غالب ہو کر کس قدر وسیع القلب اور آزاد خیال رہے ہیں۔ انھوں نے غیر مسلم مفتوحین اور اپنی رعایا سے کس درجہ عدل وانصاف، الطاف واکرام، اور امن وسلامتی کا سلوک کیا ہے۔ مسلمان حکمرانوں کے ہاتھوں غیر اسلامی معابد کا تحفظ۔ غیر مسلم رعایا کے مذاہب کی آزادی، اُن کی املاک اموال کی ذمہ داری اور اُن کی عزت وناموس کی صیانت کے نمونے دیکھنا ہوں تو اس کتاب کو پڑھیے۔ قیمت صرف ۱ر علاوہ محصولڈاک دفتر طلوع اسلام۔ بلیماران۔ دہلی سے منگوایئے۔ +

متبادل دستورِ ہند

ہندوستان کے لیئے حکومت برطانیہ نے آئندہ طرزِ حکومت کا جو ڈھانچہ تیار کیا ہے اُس میں مسلمانوں کی حیات وبقا کے سامان مفقود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانانِ ہند اس ہندو نواز اسکیم سے بیزاری کا اعلان کر کے علیحدگی کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب نے اس ناقابلِ قبول اسکیم کے مقابلہ میں ایک ایسی اسکیم پیش کی ہے جس کی رُو سے جملہ اقوام ہند کو اپنی اپنی تہذیب وثقافت کے ماحول میں پورے نشوونما کے مواقع بہم پہنچیں۔ ایک اسلامی دماغ کی یہ عادلانہ تجویز ہر عاقل ہندوستانی کی توجہ کے قابل ہے، کیونکہ اُس کی بدولت ہندوستان کی سرزمین مختلف اقوام کے خونِ ناحق سے لالہ زار بننے کے بجائے اُن کی منفرد اور مشترک مساعی کو رشکِ جنت بن سکتی ہے!

قیمت صرف ۱ر علاوہ محصولڈاک

دفتر طلوع اسلام۔ بلیماران دہلی سے طلب فرمایئے

(کتبہ انتظار احمد)

اشتراکیت اور اسلام

ہندوستان کے انقلاب آفریں کی کوشش ہے کہ آزاد ہندوستان کا نظامِ حکومت اشتراکیت ہو۔ اس رسالہ میں اشتراکیت کے اصلی مآخذ سے بتایا گیا ہے کہ اس نظام کے عناصرِ ترکیبی کیا ہیں؟ اس کے بعد واضح کیا گیا ہے کہ اس نظامِ زندگی کے متعلق اسلام کی تعلیم کیا ہے اور قرآنی نقطۂ خیال سے "حقیقی اشتراکیت" کسے کہتے ہیں۔

قیمت فی نسخہ ۲/ر محصول ۱/ر

کانگریس بے نقاب

کہا یہ جاتا ہے کہ موجودہ تحریکِ آزادی ایک خالص سیاسی تحریک ہے، جسے کسی کے مذہب و تمدن سے کچھ واسطہ نہیں۔ لیکن نقاب اٹھ جانے کے بعد یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ تحریک خالص ہندوانہ فلسفۂ حیات کی نشر و ترویج کے لئے چلائی جا رہی ہے، اور آپ حیران ہونگے کہ یہ نقاب خود کانگریس کی بڑی بڑی ذمہ دار ہستیوں کے ہاتھوں اٹھ رہا ہے۔

تفصیل کے لئے یہ پمفلٹ ملاحظہ فرمایئے۔

قیمت فی نسخہ ۱/ر محصول ۱/ر

ناظم - طلوع اسلام دہلی

مسلمان کی زندگی

وہ معرکۃ الآرا مضمون جس نے ملّتِ خوابیدہ کے عروقِ مردہ میں خونِ زندگی دوڑا دیا جس نے بتا دیا کہ مسلمان اپنی شاہراہِ مقصود سے کب ہٹا اور آج اس کا ہر قدم اسے کیوں منزل سے دور لئے جا رہا ہے۔ اس رسالہ کی عام اشاعت کی بے حد ضرورت ہے ؎

قیمت فی نسخہ ایک آنہ محصول ۱/ر

جلد طلب فرمایئے کیونکہ زیادہ تعداد میں موجود نہیں ہیں

ناظم

ادارۂ طلوع اسلام - دہلی

اسلامی معاشرت

نقش ثانی

ازجناب پرویز صاحب

دیکھنے کو تو یہ ایک چھوٹا سا پمفلٹ ہے لیکن افادی حیثیت سے بڑی بڑی تصانیف پر بھاری ہے مسلمان کی روزمرہ کی زندگی کس قسم کی ہونی چاہیئے۔ اس کا ماحول کیسا ہونا چاہیئے۔ اس کی عادات واخلاق کا خاکہ۔ اس کے رہنے سہنے کا ڈھنگ۔ اس کے تمدّن ومعاشرت کے خط وخال اس کی تعلیم وتہذیب۔ اس کے دنیاوی معاملات۔ اپنوں اور بے گانوں سے اس کے تعلّقات۔ غرض کہ اس کی انفرادی اوراجتماعی زندگی کا ہر انداز واسلوب قرآنی آئینہ میں کیسا ہونا چاہیئے۔ اِس چھوٹے سے پمفلٹ میں یہ سب کچھ آگیا ہے اور اس قدر سادہ اور دل نشین پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے کہ ہر بات سیدھی دل میں اتر جاتی ہے اور لطف یہ کہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا گیا بلکہ ہر چیز قرآن کریم کی چھوٹی چھوٹی آیات میں بیان کی گئی ہے بچوں کے لیے یہ پمفلٹ بہت ہی مفید ہے۔ اسلامی مدارس میں بطور نصاب کے داخل کرلیا جائے تو طلبا کے قلب ودماغ کی تعمیر صحیح اسلامی بنیادوں پر ہو جائے۔ قیمت ۴ر۔ محصول ۱ر +

ادارۂ طلوعِ اسلام۔ دہلی

رجسٹرڈ ایل نمبر 4240

معاملہ کی ضروری باتیں

(۱) **طلوعِ اسلام** ہر انگریزی مہینے کی یکم کو التزاماً شائع ہو جاتا ہے اور نہایت احتیاط سے حوالۂ ڈاک کیا جاتا ہے۔

(۲) رسالہ موصول نہ ہونے کی اطلاع۔ زیادہ سے زیادہ۔ دس تاریخ تک دیجئے۔ ورنہ بعد میں شاید پرچہ موجود نہ ہو۔ اور اگر موجود بھی ہوگا تو بلاقیمت نہ مل سکے گا۔

(۳) تبدیلی پتہ کی اطلاع ۲۵ر تاریخ سے پہلے پہلے آجانی چاہیئے۔

(۴) جس ماہ کی خریداری کا چندہ ختم ہوتا ہے اس مہینہ کے پرچہ کے اندر ایک اطلاع (جوابی) کارڈ رکھ دیا جاتا ہے۔ جواب ایک ہفتہ کے اندر اندر آجانا چاہیے۔

(۵) چندہ سالانہ پانچ روپیہ معہ محصول ڈاک ہے۔ اور قیمت فی پرچہ (۸ر) چندہ بذریعہ منی آرڈر بھیجنے میں خریدار کو کفایت اور منتظمین کو سہولت رہتی ہے۔

(۶) ہر رقم موصولہ (خواہ وہ کسی ذریعہ سے موصول ہو) کی ایک رسید بھیجی جاتی ہے۔

(۷) وی۔پی۔ طلب کرنے کے بعد اُسے وصول نہ کرنا ادارہ کو بلاجُرم سزا دینے کے مرادف ہے۔

(۸) منی آرڈر کرتے وقت اپنا پتہ پورا اور صاف لکھئے۔ نیز رقم کی تفصیل بھی درج فرمایئے۔

(۹) آپ اپنا تعارف **نمبر خریداری** کے ذریعہ سے ہی کرا سکتے ہیں۔ اس لیے اس نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولئے۔ ورنہ ہمیں بے حد دقت اور آپ کو ناواجب شکایت ہوگی۔

(۱۰) نمبر خریداری یاد نہیں رہا کرتا۔ کہیں نوٹ کر چھوڑیئے۔

(۱۱) "**طلوعِ اسلام**" کوئی تجارتی ادارہ نہیں۔ بلکہ ملّتِ اسلامیہ کے اجتماعی مقاصد کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ہے اس لیے اس سے اشتراکِ عمل اور معاونت ایک ملی خدمت ہے۔

(۱۲) خوش معاملگی کی استواری کی بنیاد یہ ہے کہ فریقین ہر وقت خدا کو اپنے درمیان رکھیں۔ وَاللّٰہُ المستعان

ناظم
ادارہ طلوعِ اسلام
دہلی

Printed at the Jayyed Press, Delhi.
Published by Z. A. K. from Tulue Islam Office Delhi.